شازیہ الیاس
پی ایچ ڈی اسکالر،شعبہ اُردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

# دکنی دور کی اُردو زبان کا جائزہ

***Shazia Ilyas***

PhD scholar, Urdu Department, NUML, Islamabad

**Urdu Language in Dakken: A Review**

Dakken was the region where tradition of Urdu literature flourished and is a very important period of development of Urdu language. Although most of the Urdu linguists are of the view that the initial structure of Urdu language set into northern India and then it extended towards southern part. But all of these are agreed upon the fact that first rich tradition of Urdu literature was set in Dakken. The article reviews the literature of Dakken in linguistic context.

دکنی اردو کی شعری اور نثری روایت اردو ادب میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔اس روایت نے اردو شاعری اور نثر کے آغاز وارتقاء میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ دکن کے مختلف علاقوں سے شعراء اور نثر نگار جمع ہوئے اور مختلف مقامی، علاقائی اور بیرونی زبانوں کے ملاپ سے اردو شاعری اور نثر کا دامن وسیع کرنے لگے۔اس ضمن میں دکن کی دو اہم ریاستیں بیجاپور اور گولکنڈہ اردو ادب کی ترویج اور فروغ میں پیش پیش رہیں۔ بہمنی دور میں عشقیہ اور تاریخی نوعیت کے معروف قصوں کو نظم میں ڈھالا گیا اور اسی طرح تصوف کے موضوعات کو بھی منظوم کیا گیا۔ یوں دکن میں اردو شعری روایت نے جنم لیا۔ دکن کی علاقائی بولیوں سے جو زبان کی ترتیب بنی اُس کو جانچنے سے پہلے یعنی دکنی دور کی اردو نثر کا جائزہ لینے سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ دکن کا حدود اربعہ اور وہاں کی زبان کی نوعیت کیا تھی۔

شمالی علاقے کے باشندے دریائے نربدا کے دوسری طرف کے علاقے کو ابتدا ہی سے "دکن" کہتے تھے یہ برصغیر ہند کا وہ علاقہ ہے جسے دریائے نربدا شمالی اور جنوبی علاقوں کی تقسیم کرتا ہے۔قدیم دور میں اس پر کوئی پُل نہیں تھا اور نہ ہی اسے کشتیوں کے ذریعے بڑے پیمانے پر عبور کیا جاتا تھا۔ جنوب کے علاقے یعنی دکن پہنچنے کے لیے گجرات کاٹھیاوار کے راستے جانا پڑتا تھا۔ لہٰذا جو شمالی علاقے کا بادشاہ دکن کی تسخیر کرنا چاہتا وہ پہلے گجرات کو فتح کرتا اور پھر اس راستے سے دکن جاتا۔

قدیم زمانے ہی سے امرا، حکام، فوجی، تجارتی لوگ اہل حرفہ اور مزدور وغیرہ کا گجرات کے راستے شمال سے جنوب اور جنوب سے شمال آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔اس میل ملاپ سے آنے جانے اور تجارتی روابط سے شمال اور جنوب کے لوگ ایک دوسرے کی معاشرت اور زبان سے متاثر ہوتے تھے۔شمالی علاقوں کی زبان ان آنے جانے والوں کے ہمراہ دکن پہنچتی رہی۔

اس کے علاوہ مسلمان بادشاہوں کے شمالی علاقوں میں حکومت کے مستقل قیام کے سبب صوفیاء، بزرگان دین اور مبلغین نے مختلف علاقوں میں اشاعت اسلام، اخلاق و عادات کی درستی اور عبادات کیلئے عربی تدریس کا کام سرانجام دینا شروع کیا۔

دکن کے علاقے میں بہت سی مقامی بولیاں بولی جاتی تھیں جن میں مرہٹی، تلنگی اور کنڑی بڑی بولیاں شمار ہوتی تھیں۔ان صوفیاء اور بزرگان دین کو مقامی لوگوں سے بات چیت کرنے اور پیغام حق ان تک پہنچانے میں دقت ہوتی تھی۔ یہ اصحاب فارسی، پنجابی اور ہندوی زبان اور مقامی زبانوں کے الفاظ ملا جلا کر بولتے اس طرح تین سو سال کے طویل عرصہ میں دکن کی زبان میں نئے الفاظ اس طرح شامل ہو گئے جیسے وہ مقامی الفاظ ہی ہوں۔ پھر تجارت پیشہ، فوجیوں کی آمد و رفت اور دیگر اہل حرفہ اور مزدوری کے لیے آنے جانے والے لوگوں کے ذریعے بھی شمال کی زبان مقامی زبان میں شامل ہوئی اور ایک نئی زبان (اردو) دکن میں رواج پاتی چلی گئی۔مسلمان بادشاہوں کی فتح دکن سے پہلے جو بزرگ حضرات دکن آئے اُن میں بقول ڈاکٹر جمیل جالبی درج ذیل اہمیت کے حامل ہیں۔

حاجی رومی ۱۱۶۰ء، سید شاہ مومن ۱۲۰۰ء، بابا سید مظہر عالم ۱۲۲۵ء، شاہ جلال الدین گنج رواں ۱۲۴۶ء، سید احمد کبیر حیات قلندر ۱۲۶۰ء، بابا شرف الدین ۱۲۸۸ء، بابا شہاب الدین ۱۲۹۱ء، پیر مقصود ۱۳۰۰ء، پیر جمنا ۱۳۰۳ء، شاہ منتخب الدین زرزری بخش ۱۳۰۹ء، پیر مٹھے ۱۳۳۱ء، سید یوسف شاہ راجو قتال ۱۳۳۵ء، شاہ برہان الدین غریب ۱۳۳۷ء، شیخ ضیاء الدین ۱۳۳۸ء

ان بزرگ حضرات کی تبلیغ کے ذریعے تین سو سال کے لگ بھگ اردو زبان دکن میں پروان چڑھی۔ان بزرگوں نے دکن کی مقامی زبانوں کے الفاظ شمال کی زبان میں ملا جلا کر تبلیغ دین کا کام کیا جس سے اظہار بیان کی مشکل دور ہو گئی اور ہندوی (اردو) دکن میں معروف و مقبول ہونے لگی۔عوام اسے کافی حد تک سمجھنے لگے اور شمال کی زبان کے الفاظ ملا جلا کر بولنے لگے۔

شمال کے ایک طاقتور بادشاہ علاوالدین خلجی نے دکن کو فتح کرنے کی ٹھانی وہ اپنی فوجوں کے ساتھ گجرات کو فتح کرتے ہوئے دکن کے علاقے میں پہنچا اور رفتہ رفتہ ۱۳۱۰ء تک سارے دکن کو فتح کر لیا۔ گجرات اور دکن کو اپنی حکومت میں شامل کرنے کے بعد اُس نے اُن علاقوں کو سو سو گاؤں کے حلقوں میں تقسیم کیا اور پھر ہر حلقے پر ایک ناظم مقرر کر دیا۔ یہ ناظم "امیر صدہ" کہلاتا تھا۔ یہ حاکم اپنے علاقے کے جملہ انتظامات کا ذمہ دار ہوتا تھا۔جن میں مالیات، نظم و نسق اور فوج کی ذمہ داری بھی شامل تھی۔ گجرات اور دکن کے تمام امیر اپنے پورے کنبے اور عزیز و اقارب کے ساتھ وہاں آباد ہو گئے ان سب کے آپس میں تعلقات بھی بہت اچھے تھے۔ یہ سب اپنے گھروں میں اپنی اپنی زبان بولتے تھے لیکن دوسرے ناظموں کے ساتھ اُس زبان میں بات کرتے جو وہ شمال سے اپنے ساتھ لائے تھے۔اُن کے ساتھ انتظامی امور سرانجام دینے والے فوج کے سپاہی اور افسران اور دیگر خدمت گار جو مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے جن میں پنجاب، دہلی اور وسطی ہند شامل ہیں یہ سب لوگ جب بھی آپس میں بات چیت کرتے تو ایک دوسرے کو آسانی سے سمجھانے کے لیے شمالی ہند کی زبان (اردو) بولتے تھے۔

مقامی لوگ جنہیں مختلف کام سرانجام دینے کے لیے ملازم رکھا گیا وہ بھی رفتہ رفتہ اس زبان میں بات کرنے لگے وہ اپنی زبان کے الفاظ شامل کر کے اسی شمالی ہند کی زبان کے ذریعے اپنا مدعا بیان کرتے۔ دیگر گجرات اور دکن کے باسی جن کا ناظمین سے رابطہ ہوتا یا دکاندار اور اہل حرفہ جن سے شمال سے آنے والے بات کرتے وہ بھی ایک دوسرے کی زبان کے الفاظ شامل کر کے آپس میں بات چیت کرتے۔ یہ عمل اردو زبان کے پھیلنے کا سب سے بڑا سبب بنا۔

کچھ عرصے بعد جب خلجی حکومت کمزور پڑ گئی تو تغلقوں نے شمالی ہند کی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ محمد تغلق ایک مضبوط بادشاہ تھا وہ پوری دنیا کو فتح کرنا چاہتا تھا۔اُس کے مشیروں نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ دکن کے علاقے کو اپنا مرکز بنائے وہاں سے وہ دنیا کو آسانی سے قابو میں رکھ سکے گا کیونکہ وہ مرکزی علاقہ ہے۔تغلق کو یہ مشورہ پسند آیا اُس نے دکن میں "دولت آباد" کو مرکز کی حیثیت سے پسند کیا۔اور پھر دکن پر فوج کشی کر کے تمام دکن اور گجرات کو فتح کر لیا۔اُس نے خلجی دور کے بنائے ہوئے "امیر صدہ" کے نظام کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ اُسے انتظامی امور کے لیے مزید بہتر بنایا۔

دکن پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے دہلی میں بسنے والے لوگوں میں علان کروایا کہ وہ سب "دولت آباد" کی طرف ہجرت کریں۔ کیونکہ بادشاہ خود بھی دولت آباد کو دارالحکومت بنا رہا ہے۔اور وہ بھی وہیں رہے گا۔اس شاہی حکم کے باعث بہت سے لوگ کسی نہ کسی طرح دہلی چھوڑ کر مضافات اور دوسرے شہروں کی طرف نکل گئے۔ جو نہ نکل سکے وہ قافلوں کی صورت میں دکن کی طرف روانہ ہو گئے۔ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

حکم حاکم مرگ مفاجات، درباری، عمال، امرا، شرفا، تجار پیشہ و اہل حرفہ، ارباب ہنر، نوکر چاکر، متوسطین اور امیر غریب

رخت سفر باندھ کر "دولت آباد" کی طرف چل دیئے۔[2]

آبادی کے رخصت ہونے کے ضمن میں ضیا الدین برنی کا بیان ہے۔"۔۔۔عمارتوں اور محلوں میں کتے بلی تک نہ رہے۔"[3] راستے کی تکلیفوں، کٹھن اور طویل سفر نے لوگوں کو بیزار کر دیا بہت سے لوگ راستے کی دشواریوں کو برداشت نہ کر سکے اور راستے ہی میں فوت ہو گئے۔ اس طرح یہ قافلے کچھ تو گجرات ہی میں رک گئے اور بڑی تعداد میں دکن پہنچ گئے۔ لیکن تھوڑے عرصے میں شمالی ہند سے بغاوت ہونے کی خبریں آنے لگیں۔ جس پر محمد تغلق نے پھر واپسی کا حکم دے دیا۔ یہ حکم لوگوں کے لیے جیتے جی موت کا پیغام بنا۔ لہذا بہت سے گھرانے دکن ہی میں مستقل آباد ہو گئے اور جو واپس جا سکے وہ مشکلات اور دشواریوں سے گزر کر پھر دہلی پہنچے۔ اس عمل سے بہت سے خاندان جو دکن ہی میں آباد ہو گئے اور گجرات میں رہ گئے ان کے سبب مقامی زبان دہلی کی زبان سے متاثر ہونا شروع ہو گئی۔ عوام آہستہ آہستہ اردو زبان کی طرف راغب ہوتے چلے گئے اور اس طرح دکن میں اردو زبان کا چلن شروع ہوا۔ اس دور میں امیران صدہ شمال سے آنے والی زبان کو "دہلوی" کہتے تھے۔ اور دوسرے لوگ اسے ہندی یا ہندوی کہتے تھے۔

یہ اردو کی خصوصی صفت ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے الفاظ اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ اسی خوبی کے سبب اردو میں دکنی زبان کے الفاظ ملا جلا کر بولے جانے لگے۔ اور دیکھتے دیکھتے یہ زبان پورے علاقے میں پھیلتی چلی گئی۔ اور اس طرح باہر سے آنے والوں اور مقامی افراد میں معاشرتی اور معاشی میل جول بڑھ گیا۔ اسی میل جول کے سبب آپس میں رشتہ داری، قرابت داری، محبت اور ہمدردی نے جنم لیا۔ یہ قربت اردو زبان کے لیے مہمیز ثابت ہوئی۔ اسی طرح یہ نئی زبان بغیر کسی کوشش کے پسندیدہ زبان بنتی چلی گئی۔

اس دور میں فضل الدین بلخی جو احمد آباد کے نزدیکی قصبہ کری کا رہنے والا تھا اور اپنے علم و فضل کے باعث مشہور تھا اس نے ایسے ہندوی الفاظ کو جمع کیا جو فارسی شاعری میں استعمال کیے جا سکتے تھے اور انہیں اپنی عربی فارسی لغت میں شامل کر لیا۔ لغت میں ایسے الفاظ کی تعداد ڈھائی سو سے زیادہ ہے۔ اس میں علوم و فنون۔ اصطلاحات پھول و پھل اور مختلف چیزوں کے مروجہ نام درج کیے ہیں۔ ان میں اکثر نام آج بھی اردو میں لکھے اور بولے جاتے ہیں۔ حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں۔

> بلخی نے ڈھائی سو سے زیادہ ہندی الفاظ فارسی و عربی الفاظ کی تشریح کی غرض سے اپنی تالیف میں داخل کئے ہیں۔ ان میں نصف سے زائد ایسے ہیں جو آج بھی اردو میں بغیر کسی تغیر و تبدل کے بعینہ رائج ہیں۔ جس سے صاف واضع ہو جاتا ہے۔ کہ اردو زبان ہمارے مزعومہ نظریے کے برخلاف مغلیہ عہد سے بہت قدیم ہے۔[4]

اس کی بحر الفضائل میں دی گئی الفاظ کی فہرست میں سے چند الفاظ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ تا کہ ہندوی زبان کے الفاظ کا اندازہ ہو سکے۔

جنبھائی (جماہی)، پالک (ترپھلہ)، گھر گھت (گرگٹ)، کنورا (چونہ)، برھتہ (بھرتہ)، جلاھہ (چکنا چور)، کوڈھ (کوڑھ)، (د شمنا ئیگی)، سانڈھ، بڑی لونگ، ھری چولائی، بیر، بکھان کرنیں (گانا گانا)، بھوج پتر، ملائی، جنجرو (گھونگرو)، اکھروٹ (اخروٹ)، سوور (سُور)، تانبہ، گدگدی، دھواں، گوپھن، جوک، سیدھی، تھوڈی (تھوڑی)، تھانہ، چھاچھ، کیس، پھٹکری، مسکہ، کجور (کھجور)، تھوھر، ستو، تتری (تتلی)، چیل، چوتر (چوتڑ)، پھرکی، لٹو، صفیل (فصیل)، سنداسی، (سنڈاسی)، ماندر (بندر)، گونگہ (گھونگا)، گینڈہ، کرچھن (کرچھا)، پھول، کوٹھی، چھچھوندری، ڈھینگ، کٹورہ، مونڈن (عقیقہ)، میتھی، بھنگ، گھاس، پھٹکری، کاچھہ (کچھوا) وغیرہ وغیرہ[5]

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

> یہ لغت جس میں اردو زبان کے ڈھائی سو سے زیادہ الفاظ ہیں جغرافیہ، ہیئت، موسیقی اور عروض کی بابت معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ "بحر الفضال" میں ایک اردو کا شعر بھی ملتا ہے۔ جس سے اس بات کا مزید ثبوت ملتا ہے کہ یہی وہ زبان ہے جو مسلمانوں کے ساتھ سارے برعظیم میں پھیل کر اتنی عام ہو چکی تھی کہ ایک طرف اس کے الفاظ فارسی و عربی لغات میں معنی کی وضاحت کے لیے استعمال ہونے لگے تھے اور دوسری طرف اس کے اشعار خیالات و احساسات کی ترجمانی بھی کرنے لگے تھے۔ وہ شعر یہ ہے۔

دیکھ پیکھ پیو پر گھر جاوے
تس نس منیو نیند نہ آوئے [6]

اس زبان کو بلخی "ہندوی" کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

زبان کے حوالے سے حافظ محمود شیرانی مزید لکھتے ہیں۔

اس دور کے مصنفین ہندوی الفاظ لکھتے وقت وہ مقامی زبانوں سے قطع نظر کر کے صرف اس خاص زبان کے الفاظ درج کرتے ہیں۔ جو کم از کم ہندوستان کے مسلمانوں میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ذخیرہ الفاظ ان کتابوں میں عام ہیں۔ [7]

اس دور کے لکھنے والوں کی یہ کوشش اس تہذیب کی نمائندہ علامت ہے جس میں برعظیم کی لسانی اور تہذیبی روح شامل ہے۔

نئی تہذیب اور زبان کی ترویج کو ۵۰ سال کے قریب گزرے تھے کہ "امیر صدہ" نے آپس میں مل کر مرکزی حکومت کے خلاف بغاوت کر کے اپنی حکومت قائم کر لی اور ایک امیر علاؤالدین کو بادشاہ منتخب کر لیا۔ جس نے بہمنی کے لقب سے ایک نئی سلطنت قائم کر کے تمام دکن کا علاقہ اپنی علمداری میں شامل کر لیا۔ نئی حکومت کے علم برداروں نے آپس میں یکجہتی، میل جول، اچھے روابط اور معاشرت و تہذیب کو اپنانے کے لیے مقامی روایات، تہوار، میلوں ٹھیلوں اور رسم و رواج کو ترقی دی تا کہ مقامی باشندوں میں مقبولیت حاصل کر سکیں بعد ازاں نئی حکومت نے یکجہتی کے سیاسی مقاصد بھی حاصل کر لیے۔ اس کے علاوہ برصغیر کی سب سے بڑی رابطے کی زبان جسے بین الاقوامی حیثیت حاصل تھی۔ یعنی اردو کی دل کھول کر سرپرستی کی۔ اس عمل سے اردو دکن کے لسانی اور تہذیبی اثرات قبول کرتے ہوئے آزادانہ ترقی پاتی گئی۔ اور رفتہ رفتہ دکنی الفاظ کی جگہ فارسی اور عربی الفاظ کو محاورے، تراکیب اور خیالات بھی سموتی ہوئی صاف اور نکھرتی ہوئی زبان میں متشکل ہوتی چلی گئی۔

بہمنی دور میں گجرات اور دکن کے علاقوں میں اردو کو گوجری، ہندی یا ہندوی بولا جانے لگا یعنی جو بھی یہ زبان بولتا وہ اپنی مادری زبان کے الفاظ شامل کر دیتا اس طرح ہر اُس فقرے کو ہندوی کا نام دے دیا جاتا جس میں مقامی زبانوں کے الفاظ ملا جلا کر بولے جاتے۔ اس دور کے فقروں میں دکنی، پنجابی، سرائیکی، گجراتی، برج بھاشا اور کھڑی بولی کے الفاظ بھی صاف نظر آتے ہیں۔ اور ان سب کو ملا کر ایک کرنے کے عمل سے ایک ایسا رنگ ابھر آیا جسے صوفیا، بادشاہ، امراء اور عوام سب پسند کرنے لگے۔ مختلف علاقوں کے لوگ ایک دوسرے سے اس ہندوی کے ذریعے بات چیت کرتے اور اپنا مدعا سمجھاتے اور دوسرے کا مطلب سمجھتے۔ اس کے مقابلے میں گجرات اور دکن کی مقامی زبانیں اپنے اپنے علاقوں تک محدود رہیں۔

ہندوی کا رواج اسقدر زیادہ ہوا کہ مسجدوں، مزاروں پر اسی زبان میں لکھے کتبے لگائے جاتے۔ جیسے "رائے کھڑ" کی ایک مسجد میں یہ کتبہ آج بھی موجود ہے جو ۹۲۳ء میں لکھا گیا۔ اس کتبے سے تاریخ بھی نکلتی ہے اور اس کتبے کا نقش انجمن ترقی ادب کراچی میں موجود ہے۔

تاریخ اسی مسیت کی ہوئی یوں مشہور
مسجد جامع کے بیچ ڈٹھایا یے نور [8]

اس شعر کے مصرع اول میں مسیت (مسجد) مصرع ثانی میں ڈٹھایا (دیکھا) یے (یہ) لکھا ہے پہلے دو الفاظ پنجابی زبان کے ہیں۔

ایک اور کتبہ جو شولا پور کی ایک مسجد میں لگا ہے وہ یہ ہے

اللہ نگاھباں تو جی ہر دو جہاں [9]
ہر دم کلیمہ کھو بابا جی ضابطخان

اس کتبے میں نگاھبان (نگہبان)، کلیمہ (کلمہ)، کھو (کہو) اس اصول کے تحت لکھے گئے ہیں کہ جیسے بولو ویسے لکھو۔ اس کتبے سے اس دور کے املا کا بھی علم ہوتا ہے۔ اسی طرح ضابطہ خان کو ملا کر لکھ گیا ہے یعنی "ضابطخان"

ذیل میں دکنی شعراء کے اشعار کے نمونے شامل کیے جاتے ہیں جن سے اس دور میں دکن کی زبان کا جائزہ لینے میں آسانی ہوگی۔ اور اس امر کا پتہ بھی چلے گا کہ شمالی ہندوی (اردو) کو کس حد تک استعمال کیا جانے لگا تھا۔ اور دکن میں زبان کا املا

الفاظ کا استعمال، تلفظ، تذکیر و تانیث، واحد جمع اور دیگر قواعد کا اصول کس حد تک برتے جاتے تھے۔ ابتداء میں دکنی شاعری قصہ گوئی، پند و نصائح اور تصوف کے مضامین پر مشتمل تھی بعد میں مرثیہ گوئی بھی شامل ہوئی، غزل کا رواج کافی عرصہ بعد ہوا۔

اس دور کی سب سے پہلی تصنیف فخر دین نظامی کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" ہے۔ اس کا ایک ناقص مخطوطہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی کے پاس ہے۔ ناقص اس لیے کہ اس مخطوطے کے ابتدائی اور آخری صفحات غائب ہیں اور درمیان سے بھی چند صفحات غائب ہیں۔ "اس مثنوی کی زبان بہت مشکل اور غیر از فہم ہے"[۱۰]

اس مثنوی میں مختلف بولیوں کے الفاظ ملے جلے ہیں، سنسکرت، پراکرت اور علاقائی زبانوں، کنڑی، مرہٹی، گجری وغیرہ کے الفاظ شامل ہیں۔ پھر بھی ہندوی روایت کا اثر گہرا ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

سنیا تھا کہ ناری دھرے بہت چھند
سو میں آج دیٹھا تری چھند پند
یہی دیکھ منجہ من بھگیا تری نانو
کہ جے اچھریاں ہووئے بھی ناپتیاؤ
نظامی دھرم دکھ کہوں داؤ دے
کہ پت وات گسن بات دھن سو کیے[۱۱]

شاعری کی یہ طرز اس دور میں ادبی اسلوب بن کر نکھرتی ہے اس اسلوب کے چند اشعار ملاحظہ کریں۔

نہوئے پھول پیارا کہ ھس باس بن
نہ سر گھال نے کوئی باس اس بن
بھلا بھی نہیں منجہ برا بھی نہیں
ترے پائے ہوں چھوڑ جاسوں کہیں
ننھے کی ننھی بدھ مانے نہ کوئے
ننھاں سو ننھاں جے نبی پوت ہوئے
جو کج کال کرنا سو توں آج کر
نہ گھال آج کا کام توں کال پر[۱۲]

یہ مثنوی تقریباً ساڑھے پانچ سو سال سے زیادہ پرانی تصنیف ہے۔ اس میں جو ضرب الامثال اور محاورے استعمال ہوتے ہیں اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سینکڑوں سال پرانے ہیں جو سنورتے سنورتے آج ادبی طور پر بھی استعمال ہو رہے ہیں۔

یعنی مثنوی میں استعمال ہونے والے محاورات اور ضرب الامثال آج بھی اردو میں مستعمل ہیں۔ مثنوی میں اکثر الفاظ جیسے آکھنا (کہنا)، چت (دل)، ناری (عورت)، چھند (بات، فریب) دیٹھنا (دیکھنا)، ویل (وقت)، ہوں (میں)، سجات اتم (اعلیٰ ذات)، کجات (کم ذات)، ایناؤ (ناانصافی)، کھڑگ (تلوار)، ٹھار (جگہ)، تھاس (بھاگنا)، پران (جان)، پیتاؤ (بھروسہ)، کپال (سر، کھوپڑی)، پھاندا (پھندا)، تسے (اس کو)، کئی (کی)، نانو (نام)، دوس (قصور)، دھن (عورت)، پت ورت (شوہر کی وفادار)، ددھا (ڈراہوا)، وغیرہ (الفاظ) مختلف زبانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس مثنوی کی زبان آسان نہیں۔

مگر نئے اسلوب کے اشعار جن میں ہندوی روایت موجود ہے بھی ملتے ہیں۔ جو سمجھنے زیادہ مشکل نہیں۔

نظامی کہنہار جس یار ہوئے
ستہار من نفر گنتار ہوے
کہوں سد ساجے نظامی دھرم[۱۳]
پدم سب سنے بات بانجے کدم

اور

ع چڑھاوا کیا دھرت آکاس پر[۱۴]

لطفی:

یہ سلطان محمد شاہ لشکری بہمنی (۱۴۸۲ء متوفی) کے دور کا شاعر تھا اس کا تعلق بیدر سے تھا۔ اس کی شاعری میں پرانے اسلوب کے ساتھ ساتھ نکھرا ہوا اسلوب بھی ملتا ہے۔ اس اسلوب کے دو شعر ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

خلوت میں سجن کے میں موم کی بتی ہوں
یک پاؤں پر کھڑی ہوں جلنے پرت پتی ہوں
لطفی تیرے چلن کی پا کی کہاں ہے اس میں
جیوں پانچ پانڈواں کے کہنے مودھر پتی ہوں[۱۵]

فیروز:

لطفی کے بعد فیروز کا دور آتا ہے۔ اس کا تعلق بھی بیدر سے تھا یہ (۱۵۶۴ء) میں ابراہیم قطب شاہ کے دور میں گولکنڈہ چلا گیا تھا۔ یہ اپنے دور کا مشہور شاعر تھا یہاں تک کہ وجہی اور ابن نشاطی اسے استاد مانتے تھے۔ چنانچہ اس کی وفات پر ابن نشاطی نے یہ شعر لکھا۔

نہیں وہ کیا کروں فیروز استاد
جو دیتے شاعری کا مرے داد

ابن نشاطی نے اس شعر میں شاعری کو "مذکر" باندھا ہے۔ جو اس بات کی غماز ہے کہ اُس دور میں تذکیر و تانیث کا زیادہ خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔

فیروز کی ایک مثنوی "توصیف نامہ میراں محی الدین" موجود ہے جس میں حضرت عبدالقادر جیلانیؒ اور "مخدوم جی شیخ محمد ابراہیم" کے اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔ فیروز ایک اعلیٰ پائے کا شاعر تھا۔ اس کا نمونہ کلام دیکھیے۔

مرا پیر مخدوم جی جگ منے
منگوں نعمتاں میں سدا اس کنے
وہی پھول جس پھول کی باس توں
وہی جیوں جس جیو کی آس توں
پیا جیو تھے تو ہمن ساس ہے
تو ہم جیو کے پھول کا باس ہے
کریماں کی مجلس کرامت تجے
امیناں کی صف میں امانت تجے
محی الدین مخدوم جی جاگنا
ہمیں جیو اس پیو سوں لاگنا[۱۶]

ان اشعار میں منگوں (مانگوں) تیسرے مصرعے میں " کی باس" اور ساتویں مصرعے میں " کا باس" لکھا ہے۔ یعنی ایک جگہ باس (بو) کو مونث اور دوسری جگہ مذکر باندھا ہے۔

جیو (جی) سوں (سے) وغیرہ، اُس دور کی زبان اس کی شاعری میں موجود ہے۔ یہ الفاظ یقیناً اپنے دور میں مستعمل ہوں گے۔ اور اچھے لگتے ہونگے مگر موجودہ دور میں یہ متروک ہو چکے ہیں۔ آج کل ان کی شکل تبدیل ہو چکی ہے۔ اس لیے ان میں دلچسپی کی اتنی شدت نہیں ہے جتنی اس دور میں شاید محسوس ہوتی ہو۔

مشتاق:

یہ سلطان محمد شاہ لشکری بہمنی کے آخری دور کا شاعر تھا۔ اس کی شہرت سلطان محمود شاہ بہمنی کے دور میں ہوئی اس نے سید برہان الدین شاہ خلیل اللہ کی مدح میں اردو قصیدہ لکھا تھا۔ جو اب تک محفوظ ہے۔ یہ بیدر کے مشہور بزرگ تھے۔ مشتاق نے غزلیں بھی لکھیں اور قصیدے بھی جن کے عمدہ نمونے موجود ہیں اس لحاظ سے وہ اردو کا ایک قدیم استاد سخن سمجھا جا سکتا ہے۔ اس

کی شاعری کا لسانی جائزہ لینے کیلئے نمونے کے اشعار دیکھیے۔

آب حیات اولب ترے جاں بخش و جاں پرور اہے
مشتاق ہو سے سوں پیا امرت بھری اوکل گھڑی
سورج مرجاں میں جیوں دستا نظردوں کا نپتی تھر تھر
جو لٹ پیچاں بھری سر تھے او رخ اوپر ڈھلی ہی آ
سورج کی تاب سیتے جوں پگلتا برف آپس میں
او رُخ دیکھت نظر انکھیاں کے انکھیاں میں گلی ہی آ [17]

ان اشعار میں اہے (ہے)، دستا (نظر آتا)، سوں (سے)، سیتے (سے)، انکھیاں (آنکھ کی جمع)، نظرووں (نظروں) کی صورت میں لکھا ہے۔ جو قدیم اردو ہے۔

اشرف بیابانی:

یہ بھی اُسی دور کا شاعر تھا اس نے ۱۵۰۳ء میں ایک طویل مثنوی "نوسرہار" لکھی، اس مثنوی میں امام حسینؑ کے مصائب اور شہادت نو ابواب میں لکھی ہے۔ اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے جو تفصیل اور ترتیب کے ساتھ منظوم کی گئی ہے۔ اشرف بیابانی نے جگہ جگہ اپنی زبان کا نام "ہندوی" لکھا ہے۔ اس کی زبان و بیان کا اندازہ درج ذیل اشعار سے ہوتا ہے۔

ناماں کیتا بول سنوار، جانو موتیوں کے راہار
سونے کی جیوں کھونٹی گھڑ ، مانک موتی ہیرے جڑ

ایک ایک بول یہ مانک مول ، سیم ترازو سینتھیں تول
بند پروے سونے تار، سچیں ہوا نوسرہار [18]

نوسرہار کے انداز بیان اور لہجے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مثنوی روزمرہ کی زبان سے بہت قریب ہے شاید اس لیے کہ یہ مجلسوں میں سنانے کے لیے لکھی گئی، اشرف نے مثنوی میں بامحاورہ زبان کا استعمال کیا ہے۔ کیونکہ روزمرہ کے ذریعے ہی زبان و بیان میں چاشنی پیدا کی جاتی ہے۔ جس کے سبب دوسروں کو متاثر کیا جاسکتا ہے۔ نوسرہار کی زبان صدیوں کے سفر کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس میں جو محاورے استعمال کیے گئے ہیں ان میں سے اکثر آج بھی اردو زبان میں مستعمل ہیں۔

جیسے وقت آنا (مرنے کے قریب ہونا)، اٹھ جانا (مرجانا)، غم کھانا، خوشی کرنا، زار بزار رونا' بات آنا، امیر باندھنا، صبر پکڑنا، ہاتھ ملنا، کیا موں لیکر جینا (منہ کو موں لکھا ہے) (کس طرح زندہ رہنا)' پھل پانا' من میں گانٹھ پکڑنا (دل میں کینہ رکھنا)، بازی دینا (شکست دینا)، بال بیکا کرنا، آسمان ٹوٹ پڑنا، سر سے چھتر ڈھلنا (بے سہار ہونا)، ڈانواں ڈول ہونا، قول کرنا، نہ ایدھر کے انہ اودھر ہونا (ادھر کو ایدھر اور اُدھر کو اودھر لکھا ہے)، قول کرنا (وعدہ کرنا)، جیسا کرو گے ویسا پاؤ گے، باٹ دیکھنا (انتظار کرنا)، وغیرہ وغیرہ نوسرہار مثنوی اُس دور کی قابل قدر تصنیف بن گئی ہے۔

اشرف بیابانی کی دو کتابیں اور ہیں ایک واحد باری اور دوسری لازم المبتدی، واحد باری، عربی، فارسی اور اردو کی منظوم لغت ہے اس کتاب میں اردو الفاظ کے مترادف لکھے گئے ہیں نیز ردیف قافیہ، عروض اور اصناف سخن کو بھی سمجھایا گیا ہے۔ جیسے یہ اشعار دیکھیے۔

بحر ہے دریا آب فراخ ، کلام موزوں ہے ڈالی شاخ
نیم بیت کو مصرع بول ، دو مصرع کی بیت ہے کھول
رباعی کیا ؟ چو مصرع جان ، مخمس کیا ؟ پنج مصرع خواں
قصیدہ غزل کا اول مطلع ، تخلص آخر بیت کا مقطع
ردیف بعد از قافیہ آر ، ایک گھوڑے پر دو سوار [19]

تیسری کتاب لازمی المبتدی میں لوگوں کو شرعی مسائل سمجھائے گئے ہیں مثلاً اسلام۔ایمان۔فرائض غسل، وضو، تیمم، نماز، روزہ ،عیدین، قربانی، غسل وکفن وغیرہ۔اس میں نظم کی بحر ہندوی ہے جس سے اُس دور کی عام بول چال کا اندازہ ہوتا ہے۔ جیسے: سنت غسل کی بوجھیں پانچ، پلیتی دور کہ کپڑے میں، وضو کرنا پہل غسل میں، تین بار سرسیں پاؤں لگ دھونا، پچھوں نماز پر طیار ہونا۔اشرف بیابانی کی مثنویاں پڑھ کر ساڑھے پانچ سو سال پرانی اردو ذہن میں آتی ہے جو آج بھی ہمیں مایوس نہیں کرتی۔

میراں جی شمس العشاق:

میراں جی شمس العشاق مکہ معظّمہ میں پیدا ہوئے۔۳۴ سال عرب وحجاز میں گزار کر جب دکن آئے۔تو بہمنی حکومت زوال پذیر ہورہی تھی۔عادل شاہی، نظام شاہی اور بیدر شاہی حکومتیں بن چکی تھیں۔اُنہوں نے بیجاپور کو اپنے قیام کا مرکز بنا کر تبلیغ شروع کر دی۔ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں لکھا ہے۔"ان کی تاریخ پیدائش ۱۴۹۶ء ہے۔" [۲۱] جبکہ ڈاکٹر جمیل جالبی کے تحقیق کے مطابق "ان کی تاریخ وفات ۱۴۹۶ء ہے۔"

میراں جی کا موضوع تصوف ہے انہوں نے صوفیانہ خیالات کو عام ہندوستانی بول چال میں پیش کیا۔ان کی چار مثنویاں ملتی ہیں۔جو کہ ہندوی وزن میں لکھی گئیں ہیں۔میراں جی کی مثنویاں مقامی زبانوں کے الفاظ سے بھری ہوئی ہیں اس لیے آج انہیں آسانی سے سمجھنا مشکل ہے۔یہ زبان اس لیے مشکل نظر آتی ہے کہ اس میں ایک طرف تصوف کے پیچیدہ مسائل بیان ہوئے ہیں اور دوسری طرف میراں جی کے مخاطب عوام تھے جو فارسی عربی نہیں جانتے تھے لہذا انہوں نے علاقائی زبان استعمال کی تاکہ لوگوں کو سمجھنے میں آسانی ہو۔لہذا اس کوشش میں میراں جی کی زبان ادبی زبان کے بجائے ایک عوامی سطح کی نمائندگی کرتی ہے۔ان کے ہاں کہیں کہیں آسان ہندوی کے بھی قلمی نمونے مل جاتے ہیں۔اور ایسے اشعار کافی پُر تاثیر ہیں۔میراں جی اپنے الفاظ کو ضرورت شعری کے مطابق توڑ موڑ لیتے ہیں کہیں کہیں حرف کو گرا کر اور کہیں آواز کو کھینچ کر وزن کا سر املاتے ہیں۔انہوں نے قافیوں کا بھی کوئی اصول قائم نہیں رکھا۔لیکن یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے محنت اور کوشش سے زبان کی آبیاری کی، آج ان کی زبان مشکل اور نامانوس ضرور دکھائی دیتی ہے۔مگر ان کی لامتناہی کوششوں کے باعث زبان و بیان کے نئے نئے تجربے ہوتے رہے اور اردو آہستہ آہستہ صدیوں کی مسافت طے کرتی ہوئی آج کی زبان بن گئی۔

اگر قدیم شعراء اردو میں شعر کہنے کی طرف راغب نہ ہوتے تو شاید یہ زبان ایک چھوٹے سے علاقے میں محدود ہو کر رہ جاتی۔علم وادب میں اردو زبان نے جو آج اعلیٰ مقام حاصل کر چکی ہے۔یہ سب قدیم شعراء کی عرق ریزیوں اور مشقتوں کا نتیجہ ہے۔جب بھی قدیم اردو کی تاریخ کھولی جائے گی تو ان میں میراں جی کا مقام ہمیشہ بلند نظر آئے گا۔میراں جی کی شاعری کا لسانی جائزہ لینے کیلئے نمونہ کلام دیکھیے۔

خفی غیر لاکرے، الا اللہ اثبات [۲۲]
پرتی بدھ ٹوپی ناباج کرو کی بات

اور لکھتے ہیں۔

خوش کہی مجھ کہو میراں جی عشق بڑایا بودہ
پیر کہیں میں آکہوں بیاں دھرنا اس میں سُودہ
بودہ کہے یوں تسلیم ہونا تو سچ پرت رہے [۲۳]
عشق کیے جئو دنیا بیر دوکھ یہ کون سہے

نظم شہادت الحقیقت کا نمونہ دیکھیے

یہ سب عالم تیرا ، رزاق سبھوں کیرا
تجھ بن ادا نہ کوے ، ناخالق دوجا ہوے
جے تیرا ہو کرم ، تو ٹوٹے سبھی بھرم
اس کارن تجھ کو دھاؤں اور تیرا نام لیاؤں [۲۴]
ہے تیرا نت نہ پار، کس موکھوں کروں اچار

میراں جی نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر بھی لکھی ہے۔وہ "شرح مرغوب القلوب" میں آیات قرآن یا حدیث کا ذکر کرتے ہیں اور پھر اس کا ترجمہ اور مختصر شرح بیان کرتے ہیں۔نمونہ نثر یہ ہے۔

پیغمبر کہے خدا کی آشنائی جے کوئی بوجھتا ہے۔انو کیاں توں رہکر انو تھے بوج انو تھ تو ن سن ہور چپ نکوا چہ۔اس چار باتاں کا پند ہے۔یوں شریعت میں پہلے پاوں رکھ کر طریقت شریعت میں ہے۔۲۵

میراں جی کی نثر میں بھی مقامی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں جس کے سبب نثر مشکل ہوگئی ہے۔نثر میں ان کئی رسائل منسوب ہیں۔لیکن شرح مغلوب القلوب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔وہ اپنی زبان کو ہندی کہتے تھے۔اُنہوں نے مغلوب القلوب کو عربی سے ہندی میں ترجمہ کیا۔سب رس نام کا ایک رسالہ بھی ان سے منسوب ہے۔جو وجہی کی سب رس سے پہلے لکھا گیا۔

سید شہباز حسینی:

ابراہیم عادل شاہ بیجاپوری کے دور میں بیجاپور آئے اور پھر وہیں زندگی کے باقی دن گزارے اور وہیں وفات پائی۔انہوں نے غزل میں بھی طبع ازمائی کی ہے۔انہوں نے غزل میں طبع ازمائی کی ہے۔ان کی غزل کا نمونہ دیکھیے۔

توں تو صحی ہے لشکری کر نفس گھوڑا سار توں
ہوئے نرم نہ تجھ او چڑے پس کھائے گا آزار توں
شہباز آپ خود کھوے کر ہر دو جہاں دل دھوئے کر
اللہ کی جانب ہوئے کر تب پائیگا دیدار توں ۲۶

درج بالا اشعار میں یہ الفاظ قدیم اردو کی یاد دلاتے ہیں۔توں (تو)، صحی (صحیح)، لشکری کر (حملہ کر۔لڑ)

شہباز حسینی کے ہاں بھی مقامی زبان کے الفاظ شامل ہیں اور غزل میں بھی تصوف کا مضمون ہے۔اس لیے ان کا کلام سمجھنا ذرا مشکل ہے۔

سلطنت بہمنی میں بہت سے شعراء اور مصنفین نے علم وادب کی خدمت کی انہوں نے دکن میں علم وفضل کی ایک ایسی فضا پیدا کر دی تھی۔جو ان کی سلطنت کے بعد ان کی جانشین حکومتوں اور خاص کر بیجاپور اور گولکنڈہ میں ایسی نشو ونما پائی جس پر جتنا بھی ناز کیا جائے کم ہے۔ان لوگوں نے اپنی صلاحیتوں سے اردو زبان کے مزاج اور مذاق کو ایک میعار دیا۔اگر یہ لوگ ایسا نہ کرتے اور اس زبان کو اپنے اپنے انداز میں استعمال نہ کرتے تو یہ زبان پنپ نہ سکتی۔اس وجہ سے بہمنی دور میں اردو زبان ہر طرف پھیل کر دکن کی سب سے بڑی واحد مشترکہ زبان بنی جس میں ہندوی روایت کی بھی توسیع اور وقت کے ساتھ ساتھ فارسی زبان وتہذیب کے اثرات بھی پروان چڑھے۔بہمنی دور کی زبان میں مختلف مقامی زبانوں کا استعمال نظر آتا ہے۔مثلاً کھڑی بولی، برج بھاشا، اودھی، سرائیکی، پنجابی، راجستھانی، سنسکرت اور گجری وغیرہ زبانیں اس میں شامل ہیں اس کے علاوہ عربی فارسی اور ترکی کے الفاظ بھی موجود ہیں۔جن کے سبب زبان ایک معجون مرکب بن گئی۔لیکن شعراء کی کوشش سے زبان آہستہ آہستہ صاف ہوتی گئی اور رابطے کی زبان یعنی اردو میں تبدیل ہونا شروع ہوگئی۔

عادل شاہی دور میں ہندوی (اردو) کو دفتری زبان قرار دے دیا گیا لیکن اس کا نام زبان کے پختہ ہونے کے بعد اور کچھ مغل بادشاہوں کا بار بار حملوں سے نفرت کے اظہار کے طور پر ہندوی کے بجائے "دکنی" رکھ دیا گیا۔سب سے پہلے قریشی مصنف بھوگ بل ص ۱۶۱۴ء نے اردو شاعری اور زبان کیلئے "دکنی" کا لفظ استعمال کیا۔بعد میں یہ زبان "دکنی اردو" کے نام سے مشہور ہوئی۔اسی طرح گجرات میں اردو کے لیے "گجری" لفظ استعمال ہونے لگا۔

بہمنی دور میں قواعد کے اصول مقرر نہیں ہوئے تھے اور مختلف زبانوں کے اصول بیک وقت استعمال کیے جا رہے تھے مثلاً جمع بنانے کے تین طریقے تھے آخر میں "اں" لگا کر "وں" لگا کر اور "ن" لگا کر۔اسی طرح ماضی مطلق میں کہیا، لیا، یا وغیرہ بھی ملتا ہے اور رہیو۔آیو وغیرہ کا طریقہ بھی موجود ہے۔اس دور میں مذکر مونث کے اصول نہیں تھے کسی لفظ کو کہیں مذکر لکھ دیا جاتا اور کسی جگہ مونث لکھا جاتا۔اسی طرح ایک ہی لفظ کبھی متحرک لکھا جاتا اور کبھی ساکن۔

املا کا بھی کوئی باضابطہ طریقہ کار نہ تھا۔مثلاً وضع، نفع، ضمیر، حکم اور خطرہ کو وضا، نفا، ہیوکم اور خطرا لکھا جاتا۔ٹ، ڑ، ڈ حروف "ط" کے بغیر "ت"، "ر" اور "د" لکھے جاتے۔کہیں کہیں ان حروف پر چار نقطے لگا دیئے جاتے جیسے ڈ کو "ذ" لکھا جاتا۔"ک"

اور " گ" دونوں میں ایک ہی کش ہوتا۔" ہ اور " ھ" کے استعمال میں بھی اپنی مرضی اختیار کی جاتی عموماً بڑی " ے" کی جگہ چھوٹی "ی" لکھی جاتی۔

قافیہ بھی قریبی آواز کے قیاس سے باندھا جاتا جیسے روح کا شروع اولیاء کا روسیا وغیرہ فاعل کے لیے لفظ کے بعد "ہار" لگا دیا جاتا جیسے " پالن ہار"، "سرجن ہار" وغیرہ لفظ کے آخر میں " پن" لگا کر بھی لفظ بنا لیے جاتے جیسے ایک پن، دو پن وغیرہ اسی طرح اگر شعر میں فاعل جمع ہے تو فعل اور صفات بھی جمع بنا دی جاتیں جیسے "اکھرتیاں، پھرتیاں، چھلتیاں اور چلیاں"

فاعل علامت "نے" کا استعمال بہت ہی کم نظر آتا ہے۔افعال معاون اس طرح لکھے جاتے تھے جیسے اہے (ہے)، اہیں (ہیں)، اتھے (تھے) اور تھیا۔تھیاں (تھا۔تھے) وغیرہ

اگر ضمائر کو دیکھیں تو میں مجہ (مجھ)، ہمن (ہم)، ہمنا (ہمیں)، تجہ (تجھے)، تمن (تم)، اوسے (اسے)، وو (وہ)، آنن۔انوں (ان کو) وغیرہ۔اس کے علاوہ درخت کے لیے (رُکھ) آواز کے لیے (ناد) آنسو کے لیے (آنجھو)، نام کیلیے (نانو)، سر کے لیے (سیس)، آنکھوں کے لیے (نین)، دانت کے لیے (دسن) سورج کے لیے (سور) بادل کے لیے (ابھال) وغیرہ وغیرہ

اس دور کی زبان کے جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اردو نے اپنی تشکیل میں اپنے مزاج کے مطابق برصغیر کی تقریباً تمام زبانوں کو کسی حد تک اپنے اندر جذب کیا ہے۔اور ایک بڑی اور ادبی زبان کے طور پر اہل برصغیر کے لیے رابطے کی زبان بنی ہے۔

بیجا پور کے عادل شاہی دور کے مشہور شاعر جو ادبی روایت اور تصوت کے نمائندہ شعراء تصور کیے جاتے ہیں وہ شاہ برہان الدین جانم (۱۵۴۳ء تا ۱۵۹۱ء) تھے۔وہ میرانجی شمس العشاق کے فرزند تھے اپنے وقت کے مشہور صوفیا میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ جانم بڑے اعتماد کے ساتھ ہندوی میں شاعری کرتے تھے اور وہ اسے عیب نہیں سمجھتے تھے وہ لکھتے ہیں۔

عیب نہ داکھیں ہندی بول    معنی نو چک دیکھ دھنڈول
ہندی بولوں کیا بکھان    جے گُر پرساد تھا منج گیان[۲۷]

جانم کے زمانے تک اردو زبان کی روایت اتنی پختہ ہوگئی تھی کہ اس زبان میں ہر قسم کے خیالات کا اظہار کیا جاسکتا تھا۔ جانم نے کئی طویل اور کئی مختصر مثنویاں لکھیں۔ان کی مثنویوں کے موضوع زیادہ تر وصیت الہادی، بشارت الذکر، سکہ سہیلا، منفقت الایمان، فرمان از دیوان، حجت البقا اور ارشاد نامہ وغیرہ مشہور ہیں۔

جانم کا بنیادی موضوع تصوف اور اخلاق ہے۔اس کے فکر و اظہار کا محور عقیدت مندوں کی ہدایت ہے۔انھوں نے اپنی شاعری کے اوزان ہندی رکھے ہیں۔نیز موضوع کے سبب عربی فارسی الفاظ کا استعمال بھی زیادہ ہے اور کئی نظموں کی بحریں بھی فارسی کی استعمال کی ہیں۔جیسے جانم کی "منفعت الایمان" کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

ہے روایت مشاہدہ بے چوئی نہاں، چشم دل حاصل وہ دیکھے عیاں
بیا سانچہ مانیاں جیسیا یاس یوں، کلی پھول کھیلیا بھریا باس جوں
قرآن تفسیر اور کتاب ، جینا قول ہے سوال جواب
بعضے آکھیں جھومر جوت ، آوے ناجاوے نہ بس موت
محیط سب میں دستا ناد ، بن اس پوچھیں سب ہے یاد
ان کی نظروں نہیں ظلمات ، سورج نکلیا جیسا رات[۲۸]

---------------

نبی ولی کے سب اقوال ، سمجا ناہیں وہ کس حال
بوجھیں ناہیں راہ سلوک ، غفلت راہ لگ بھولے چوک
یو فرمائے شاہ برہان ، اس میں آہے نفا ایمان[۲۹]

ان اشعار میں آکھیں (کہیں)، دستا (نظر آنا)، نکلیا (نکلا)، سمجا (سمجھا)، یو (یہ)، نفا (نفع) جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔پھر بھی اردو صاف ہوتی نظر آ رہی ہے۔اس مثنوی کی بحر بھی ہندوی (اردو) ہے۔

جانم نے نظموں (مثنویوں) کے علاوہ دوہرے اور گیت بھی لکھے ہیں۔یہ ہندی روایت سے تعلق رکھتے ہیں۔جانم کی

شاعری اردو ادب کے لسانی نقوش کی نشاندہی کرتی ہے۔ جانم نے نثر بھی لکھی ہے۔ کلمۃ الحقائق اور رسالہ وجودیہ ان کی اہم نثری تصانیف ہیں۔

جانم نے اپنی نثری تصانیف میں شریعت وطریقت کے مسائل جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ رسالہ کلمۃ الحقائق ان کی تصنیف ہے۔ اس میں تصوف کے مسائل سوال وجواب کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں اس کی نثر کے اسلوب کو اردو نثر کا دکنی ادبی اسلوب بھی کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً یہ اقتباس دیکھیے۔

توں بندہ خدا تھے تو فعل تیرے وہ بھی خدا تھے۔ جسے تیری طاقت میں آوتا و کار کمال قدرت غالب[۳۰] آں خداست و نہ بنی کہ در کار دنیا نفسانی جہد کوشش تدبیر قوی دیکھلا تا و در کار خدائی یعنی کاہلی می کند انصاف نہ شوی در خور

ایسا معلوم ہوتا ہے اردو کا نثری اسلوب فارسی اسلوب کا سہارے لیکر کھڑا ہو رہا ہے۔ جملوں کی ساخت میں فارسی نثر کا رنگ غالب ہے۔ اس طرح ارشاد نامے کا ایک شعر ملاحظہ کریں۔

صفت کروں کچھ اپنا پیر　　　جس تھے روشن ہوئے ضمیر[۳۱]

اس شعر میں تھے (سے) کی جگہ استعمال کیا ہے باقی تمام الفاظ اردو کے ہیں اس لیے یہ کہنا بجا ہوگا کہ عادل شاہی دور میں دکنی نثر نکھر کر ارود کے کافی قریب آ گئی تھی۔

عبدل:

ابراہیم عادل شاہ کے دور میں عبدل نے "ابراہیم نامہ" کے نام سے ۱۶۰۳ء میں ایک طویل مثنوی لکھی جس میں بادشاہ وقت کی ذات وصفات کو موضوع سخن بنایا۔ یہ مثنوی فارسی بحر میں لکھی گئی (فعولن فعولن فعولن فعول) ''مثنوی ابراہیم نامہ'' کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

> "ابراہیم نامہ" کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدل میں نہ صرف شعریت کا رچاؤ ہے بلکہ تخیل سے ایوان شاعری سجانے کی بھی بڑی صلاحیت ہے اس نے اپنی تحقیقی قوتوں سے ایک خشک موضوع میں زندگی کا رنگ بھر دیا ہے ساری مثنوی میں ہندوی' تلمیحات، صفات اور دیو مالا کا استعمال کیا گیا ہے لیکن ساتھ ساتھ عربی ایرانی تلمیحات، صنمیات اور ارشادات بھی استعمال میں آئے ہیں۔ جزیات نگاری اس مثنوی کی ایک اور اہم خصوصیت ہے۔ عبدل نے ہر چیز کو ہر بات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور واقعہ نگاری میں حقیقت پسندی کو شاعرانہ تخیل کے ساتھ ملا کر اپنے دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ کہ محل، باغ، مجلس، حسن نسوانی، شہر، آرائش، دربار، محفل رقص وسرور کی تصویریں آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہیں۔[۳۲]

عبدل کا رنگ سخن شاعرانہ تخیل، تشبیہات، استعارات اور تصویر کشی ساری مثنوی کے حسن میں اضافے کا باعث بنے ہیں۔ عبدل کی مثنوی میں فارسی الفاظ کا تناسب بڑھا ہوا ہے جو عادل شاہی دور میں بالکل نہ تھا یہ ایک قسم کی جدیدیت تھی جس کا اظہار عبدل کی مثنوی میں ہو رہا تھا۔ بادشاہ کے دربار میں رقص کی محفل میں ناچنے گانے والوں کے حسن و جمال کا بیان عبدل کی مثنوی میں کچھ یوں آتا ہے۔

کوئی بالوں کے درمیان یوں مانگ چیر
جسے جیوں کسوئی میں سوئے کیر
کوئی باندھ جوڑا دسے یوں نمائے
سونے کے سرو پر بیٹھا مور آئے
کوئی گوند چوٹی لگی پیٹھ آئے
کندن کھاپ ترحنا جیوں درمیاں سہائے
کوئی مکھ ادھر پر سو لعلی دھری
رکھے آرسی بیچ کنول پنکھڑی
کہ پازیب سینا صدر عشق کا

رکھے بھول دو ڈھک مہر مشک کا [۳۳]

عبدل کی مثنوی میں لسانی اعتبار سے واحد جمع بنانے کا طریقہ اور ضمائر۔اسم صفت اور فعل کی وہی شکلیں ملتی ہیں جو دکنی ادب کا حصہ رہی ہیں۔ برج بھاشا کے الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں اور فارسی عربی الفاظ کا بھی استعمال کیا گیا ہے اس مثنوی کی بحر اور آہنگ فارسی ہے۔اس مثنوی سے دکنی اردو کے ایک نئے سفر کا آغاز ہوتا نظر آتا ہے۔

امین:

امین مقیمی کا ہمعصر تھا۔امین نے ایک مثنوی "بہرام وحسن بانو" لکھی۔لیکن وہ اس مثنوی کو مکمل نہ کر سکا اور انتقال کر گیا۔ اس مثنوی کو ایک اور شاعر مرزا دولت شاہ نے مکمل کیا۔اس مثنوی میں اردو کا رنگ گہرا ہے اور ہندی زبانوں کا کم ہو گیا ہے۔ یہ مثنوی اس دور کی شاعری کا ایک قابل ذکر نمونہ ہے اس مثنوی کی زبان، لہجہ اور بیان میں ایک تبدیلی کا احساس ہوتا ہے جب کہ اس دور کے دوسرے شعراء کی زبان بھی اجنبی لگتی ہے۔اس مثنوی میں شادی کا جو سماں دکھایا گیا ہے اُس کی زبان سے اُس دور کے اسلوب کا پتا چلتا ہے۔اس کے لیے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں۔

کیا فرش زریں سو ہر ٹھار پر
بنائے محل سارے گلزار پر
بچھے قالیناں بیچ ایوان کے
دھرے تکیے بغلی بڑی شان کے
کیا آب پاشی وہاں ہر زماں
صبح وشام چھڑکا ہوئے بے گماں
تھے چھتیس باجے اسی ٹھار [۳۴]
بجا نہار موجود تھے کار گر [۳۵]

کمال خاں رستمی:

سلطان محمد عامل شاہ کا دور فارسی سے اردو ترجموں کا دور ہے۔کمال خاں رستمی کا "خاور نامہ" بھی ایسا ہی ایک ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ ملکہ کے کہنے پر کیا گیا۔حکم یہ تھا کہ جو بھی خاور نامہ فارسی کو اردو میں ڈھالے گا اسے انعام واکرام سے نواز جائے گا۔اور وقت کے دیگر شعراءء کے مقابلے میں ممتاز بنا دیا جائیگا۔رستمی نے اس کام کو اپنے سر لیا اور ڈیڑھ سال کے عرصے میں خاور نامہ کا بیت بہ بیت ترجمہ کر دیا۔

دکنی اردو کے "خاور نامہ" میں چوبیس ہزار اشعار ہیں جو ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔جس سے رستمی کا نام ہمیشہ روشن رہے گا۔خاور نامہ اردو زبان کی طویل ترین مثنوی ہے۔اس ترجمے کی بدولت اردو میں اظہار بیان کی قدرت، نئے الفاظ، تراکیب، تلمیحات، رمزیات، تشبیہات وغیرہ نے اردو زبان کے ذخیرہ لغت میں اضافہ کیا چند اشعار ملاحظہ کریں۔

مستی سوں سیج میں جب مست اوٹھے ہیں
شوخی سوں نین دو میری سدبد کو لوٹے ہیں
رُساں سو تمن موت ہے منجہ کتیوں روٹھے پھیر [۳۶]
یو بات تو اُسنے کی نہیں گو کہ روٹھے ہیں

محمد ابراہیم صنعتی:

محمد عادل شاہ کے دور کا شاعر ہے اور دربار سے منسلک رہا ہے اس نے مثنوی قصہ "بے نظیر" لکھی ہے۔ یہ مثنوی ایک داستان ہے جس میں مافوق الفطرت واقعات موجود ہیں۔صنعتی فارسی دان تھا لیکن عوام میں اپنی داستان کو مقبول بنانے کے لیے اس نے اسے دکنی اردو میں لکھا تا کہ سب آسانی سے سمجھ سکیں۔اس کا اسلوب فارسی اسلوب ہے۔ یہ مثنوی اردو کے معیاری اسلوب سے کافی نزدیک ہے۔اس کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

ثنا بول اول توں سبحان کا

جو خلاق ہے جن و انسان کا
اپس عشق سوں اس کو پیدا کیا
سو اپنی محبت سوں شیدا کیا
تو یوں دوستاں کا مددگار ہے
بجز شرک سب کوں تو غفار ہے [۴۶]

مزید دیکھیے۔

سخن گنج ہے عالم الغیب کا
سخن موج زن ملک لاریب کا
سخن کا عجب کچھ قوی باز ہے
ازل تا ابد جس کوں پرواز ہے
سخن کا سدا سبز گلزار ہے
سخن کا سدا گرم بازار ہے [۴۷]

حسن شوقی:

حسن شوقی کی وفات ۱۶۳۳ء میں ہوئی۔ وہ حسین نظام شاہ کا درباری شاعر تھا۔ حسن شوقی مشہور مثنوی نگار اور غزل گو شاعر تھا۔ اس کے دور میں مثنوی اور غزلوں میں اردو زبان کی نکھری صورت سامنے آنے لگتی ہے۔ جو دکنی زبان سے جدا ہے۔ مثنوی کا اسلوب فارسی ہے اسی طرح غزلوں میں رواں بحروں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ چند اشعار درج ذیل ہیں۔

شوقی ہمارے عشق میں کئی زاہدان مشرک ہوئے
اس مذہب کفار میں تیری مسلمانی کیدر [۴۸]

تجہ زلف تے پیچاں اگر مشرک ہوا تو کیا عجب
اسلام میں جی ہے زبوں اور کفر میں بل کھٹ ہوا

در بزم ماہِ رویاں خورشید ہے سرجن
میں شمع ہوں جلوں گی وہ انجمن کہاں ہے

از ہن تا خراساں خوشبو کیا ہے عالم
تس شاہ مشکبو کا گل پیرہن کہاں ہے [۴۹]

نہ کر تعریف مجنوں کی کہ الماضی ولا یذ کر
ہمارا عشق مستقبل ہوا ہے کارسازی میں [۵۰]

شربت اپس ادھر کا گرمجہ پلاو پیا رے
بے سُد ہوا ہے شوقی تجھ عشق کے اثر تے [۵۱]

حسن شوقی کی مثنوی میں اردو اور فارسی کا اثر زیادہ ہے مقامی زبانوں کے الفاظ کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ مثلاً کیدا (کدھر)، تجہ (تیری)، سرجن (محبوب)، تس (اس۔ تجھ)، تے (سے، کے)

شاہ امین الدین اعلی:

شاہ امین الدین اعلیٰ ۱۵۹۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۶۷۵ء میں وفات پائی۔ وہ برہان الدین جانم کے فرزند تھے۔ دکن کے چند برگزیدہ بزرگوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ آج بھی ان کا روضہ ہر خاص و عام کے لیے باعث کشش ہے۔ اُن کی مشہور نظمیں "محبّ نامہ۔ کلام اعلیٰ اور رموز السالکین" نظم میں ہیں۔ "جودیہ" نظم اور نثر میں مشترک ہے اسی طرح "گفتار امین الدین اعلیٰ" بھی نظم اور نثر میں ہے۔ ان کی تمام تصانیف کا موضوع اخلاق اور تصوف ہے۔ ان نظموں میں ہندوی بحر استعمال ہوئی ہے لیکن عربی فارسی الفاظ کی تعداد مقامی زبان کے الفاظ سے زیادہ ہے۔ "گفتار امین الدین اعلیٰ" کے چند اشعار دیکھیے۔

نہیں ہے اللہ دوجا کوئے
اللہ سوں ویک سب کچھ ہوئے
مطلق بالا امین پیوٗ
جاگ جگایا تم سب جیوٗ
عین ارادت جس کے ہات
جیو جوالا سب سنگات[۴۲]

رموز السالکین کے اشعار ملاحظہ کریں۔

نور وہی جے مطلق نور
قید مو قید تھی وہ دور
نور شاہدہ ہے جمال
بوجھے تورے کا ہی حال
حق کی راہ میں پکڑ یقین
کیوں نہ اس کوں ہوئے یقین[۴۳]

"محبّ نامہ" عشقیہ نظم ہے جس میں محبوب کا سراپا بیان کیا گیا ہے۔ اس نظم میں فارسی بحر استعمال کی گئی ہے۔ ردیف کے تسلسل نے اسے غزل کا روپ دے دیا ہے۔

دندان مثال بجلیاں رخشاں کلام کرنیں
زہرہ دھرے نہ دیدہ خوبیں نہ چھادتے کوں
نافہ چو ناف معطر سامان کان خوشبو
دیتا برائے شہرت ان چاشنی مرک کوں[۴۴]

"وجودیہ" کا وہ حصہ جس میں نثر ملتی ہے علوی و سفلی کے مسائل پر ہے۔ لیکن یہ مسائل تصوف کے گرد ہی گھومتے ہیں۔ امین الدین علوم کی اقسام پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

علوی کے مرتبے چار ہیں۔ سفلی کے مرتبے چار ہیں۔ علوی کے مرتبے اول مقام شہود دوم مقام محبت سوم مقام حال چہارم سفلی مرتبہ اول تنگی لذت، دوم شہوت، سوم خطرات نیک متعلق دل چہارم ممتنع دیر عروج و نزول آدمیاں کا۔۔۔ دل روح نور پچھانتا با مرشد سوں نہیں تو نہیں۔ نفس چھوڑ دل چھوڑ روح چھوڑ نور کا جانیا تو اسکوں ماں کے پیٹ میں کا حال آوے گا۔ اس سوں خدائے تعالیٰ خشحال ہوے گا۔ اس کوں مقام مرتبے ہیں۔[۴۵]

یہ نثر ترتیب اور جملوں کی ساخت کے اعتبار سے اور فاعل فعل اور مفعول کی ترتیب میں بڑی حد تک با قاعدہ ہے اور پرانی نثر کے نمونوں سے آگے بڑھی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

"گفتار شاہ امین الدین اعلیٰ" کی نثر میں عبارت مقفیٰ و مسجع رکھنے کی کوشش کی گئی ہے نیز نثر میں شعری انداز اور مزاج کی جھلک نظر آتی ہے۔ نمونے کے لیے نثر کا ایک ٹکڑا ملاحظہ کیجئے۔

خاصیت خاکی، موکل فرشتہ، مہتر جبرئیل، رنگ زرد، گاں اور گوشت، استخواں اور پوست، اے رے جیتے پشم
سب جاں خاکی دم، خاصیت آب، موکل فرشتہ، مہتر میکائیل، رنگ سرخ، مغز آب منی، اس تن کا تیز غنی، پیش

آب اور جلاب پانچواں خوبی آب ۔۔۔[۴۶]

یہ عبارت اس لیے کچھ مشکل ہے کہ اس میں تصوف کے اسرار بیان کیے گئے ہیں جو مشکل ہیں تیسری نثری کتاب کلمتہ الاسرار کی نثر سابقہ دونوں نثر کے نمونوں کے مقابلے میں صاف ہے۔اس کتاب میں کلمہ طیبہ کی تشریح ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔یہ تصنیف امین الدین اعلی کی سب سے دلچسپ تصنیف ہے اور اس دور کی نثر کا ایک قابل قدر نمونہ ہے۔اس نثر کا نمونہ یہ ہے۔

> مرید نے پوچھا مرشد کامل سوں کہ مرشد رہنما والے ہادی صاحب زماں کلمہ کا کیا معنا ہے۔سو بولو ہور مہربانی کرکے یو رمز مجھ پر کھولو۔تب مرشد نے فرمائے کہ کلمہ کا ظاہر معنا یو ہے کہ نہیں کوئی معبود برحق مگر اللہ ہے ہور محمد بھیجے گئے ہیں اس معنی کوں برحق کہ جاننا ہور اللہ کو ایک کر ماننا۔تب ظاہر کا مسلمان ہوا۔لیکن کلمہ کا باطنی معنا اور ہے جب لگ اوس باطنی معنی کو نہیں سمجیا تب لگ باطن میں مسلمان نہیں ہویا۔[۴۷]

امین الدین اعلی کے زمانے میں نظم اور نثر پر فارسی اسلوب کا غلبہ تھا۔اور یہ اسلوب جدید اسلوب کے قریب آ گیا تھا لیکن مزاج میں ہندوی اسلوب بسا ہوا تھا جس کا اظہار بھی ادب میں ہو رہا تھا۔

محمد نصرت نصرتی:

۱۶۷۴ء میں نصرتی کی وفات ہوئی۔بہت عالم فاضل شاعر تھا اس کی علمیت کے سبب اسے ملا نصرتی کہا جاتا تھا اس کی شاعری کی بڑی دھوم تھی اور اسی وجہ سے وہ شاہی دربار تک پہنچا اور ملک الشعراء کا خطاب پایا۔اس کی نظموں کی کتابوں میں " گلشن عشق "، " علی نامہ "، " تاریخ سکندری " اور " دیوان نصرتی " ہیں۔دیوان میں غزلیات، قصائد، ہجو اور رباعیاں شامل ہیں۔گلشن عشق ایک عشقیہ داستان ہے یہ " منوہر اور مدمالتی " کی داستان عشق ہے۔جو عام داستانوں کی طرح شہزادوں اور شہزادیوں کی داستان ہے۔" گلشن عشق " اور " علی نامہ " میں منظر نگاری، جذبات نگاری اور جزئیات نگاری کے نادر نمونے موجود ہیں۔نصرتی کا عشق مجازی ہے۔یعنی اس کا عاشق جیتا جاگتا گوشت پوست کا وجود رکھتا ہے۔اس کی غزلیں عورت کے گرد گھومتی ہیں کبھی کبھی ان میں عورت کو دیکھ کر ایک قسم کی " للچاہٹ " کا احساس ہوتا ہے۔

ہے نصرتی جگت میں جنم حسن کا بھوکا
نعمت تجہ ایسی پائے پہ رہے دل صبور کیا

خوباں کے دل کے پیار کا بندہ ہے نصرتی
کڑوا ہے دل تو موں کوں جسکا تس شکر نکو[۴۸]

ذیل کے اشعار میں عورت کے وصل کی خواہش ہے۔اور نصرتی اس احساس کو زندہ رکھنا چاہتا ہے۔

چل وصل کا شربت چکا مجہ بیگ بنچالی
برھا کی اجل کی جو مبادا تلک آوے
اس خام سن میں دیکھو کیا پختگی کا فن ہے
دینے کوں وصل کا بل لینے کو جؤ اوتالی
سرمست نصرتی سوں چل سی نہ تجہ حریفی
خوباں کی بزم کا ہے وہ رند لا ابالی[۴۹]

ان اشعار میں پُکا (چکھا)، مجہ (مجھ)، اوتالی (بے صبر)، جؤ (دل۔جی) قدیم اردو کے الفاظ ہیں۔

نصرتی کی عشقیہ شاعری نے بادشاہ وقت اور عوام کا دل موہ لیا اور نصرتی اپنے دور کے تمام شعراء سے زیادہ مقبول ہو گیا۔بادشاہ نے ملک الشعراء کا خطاب دیا نصرتی کا بیجاپوری روایت کا ایک شعر جو محبوب کی خلوت میں کہا گیا۔ملاحظہ کیجیے۔

تیرے او نار پھل پرھت دھریا تو توڑلیوں نا

منجے اتنا بھی حاصل کیا نہ ہوتا تجہ جوانی کا [۵۰]

اسی طرح ریختی کا ایک اور شعر ملاحظہ کریں۔

میں مست ہو کر سیج میں بے تاب ہو رہی تھی لپٹ
باتاں پرم کی گاڑ کر منجہ کیوں جگاتا سادسے
ہو ابھی ادھر پر ادھر لٹس پر لطافت کے پتے
ایسا مکر منجہ سات کر جوں دلبر باتا سادسے [۵۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی نصرتی کے بارے میں اپنے خیالات کا اس طرح اظہار کرتے ہیں۔

> زبان کی شیرنی، تخیل کی پرواز اور چند الفاظ میں معنی کا دفتر بیان کر دینا نصرتی کی شاعری کی وہ خصوصیات ہیں جو اس دور کے کسی دوسرے شاعر کے ہاں اس طور پر نظر نہیں آتیں قصیدوں میں اس کے تخلیقی عمل نے ایک ایسا رنگ جمایا ہے کہ نصرتی اردو کا پہلا بڑا قصیدہ نگار بن کر سامنے آتا ہے۔[۵۲]

سید میران ہاشمی:

ان کی وفات ۱۶۹۷ء میں ہوئی۔ علی عادل شاہ کے زمانے کا مشہور شاعر تھا۔ بچپن ہی میں بینائی سے محروم ہو گیا تھا۔ پھر بھی اس کا تخیل بڑا اعلیٰ پائے اور کمال کا تھا۔ وہ ایک قادر الکلام اور پُر گو شاعر تھا۔ اس نے غزلیں، قصیدے اور مثنویاں لکھیں ہے۔ اس کی نظم کی کتابوں میں " مخمس درنعت و مدح مہدی جونپوری" معراج نامہ " مثنوی عشقیہ، مثنوی یوسف زلیخا اور دیوان ہاشمی شامل ہیں۔ "معراج نامہ " کی حیثیت میلا دناموں جیسی ہے اسے پُر تاثیر بنانے اور محفلوں کو گرمانے کے لیے لحن کے ساتھ پڑھا جاتا تھا اور پڑھا جا سکتا ہے۔ قصہ یوسف زلیخا ایک طویل مثنوی ہے۔ ہاشمی نے اچھی شاعری کے لیے سلاست کو معیار ٹھہرایا ہے۔ اس کا ذکر وہ اسطرح کرتا ہے۔

سلیس بول قصہ ہے گر ہوش مند
سلیس بول کریں عاقلاں سب پسند
سلیس بولنا بارکی کا ہے کام [۵۳]
سلیس کوں تو عزت ہے جگ میں تمام

ان اشعار میں کوں (کو)، عاقلاں (عاقل کی جمع)، بارکی (باریکی) استعمال کیا ہے۔ ہاشمی کی عشقیہ شاعری لکھنو کی خارجی شاعری کی طرح ہے ہاشمی کی محبوبہ شوخ اور الہڑ عورت ہے۔ ہاشمی جب محبوبہ کے لباس اور بدن کی تعریف کرتا ہے تو بیجاپور کی کھوکھلی تہذیب کا اظہار ہوتا ہے۔ ہاشمی اس دور کا شاعر ہے جب عادل شاہی حکومت زوال پذیر ہو رہی تھی اور یہ زوال پذیری اخلاقی اور تہذیبی زوال پذیری کا سبب بن گئی تھی۔ ہاشمی کے اشعار اسی مٹتی ہوئی تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں۔ نمونہ کیلئے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

کوئی مرد جاتا دیکھ کر موں نیں چھپاتیاں شوخڑیاں
کی کی وقت لک دیکھتیاں ہیں دھیٹ نظراں گاڑ کر [۵۴]

کرو جو کچھ وہ راضی ہے سنو یہ ہاشمی بھر لو
جو کوئی عورت رہتی ہے چپ یکا یک بات بگڑے پر [۵۵]

ہری چولی کی کیا تعریف کروں اودے ڈنڈا رس کا
تو گوری خوب لگتی ے تہبند تو لال اطلس کا [۵۶]

گوری کا رنگ گورا چولی بنفشی زر کی

لگتی ہے لال چولی کیا خوب ہری تہبند پر[۵۷]

موں (منہ)، چھپاتیاں شوخڑیاں (اگر فاعل یا مفعول جمع ہو تو فعل اور صفت بھی جمع کر دیتے ہیں)، دیکھتیاں (یہ بھی اسی طرح ہے)، کی کی (کتنے)

ہاشمی کی زبان میں دکنیت ہے لیکن اس کی دکنیت سلیس ہے۔ وہ بیک وقت دو کام کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ سلیس دکنی زبان کو کام میں لاتے ہیں دوسرے یہ کہ جہاں سمجھتے ہیں وہاں خصوصاً غزل فارسی کے الفاظ، لہجہ اور اسلوب کو بھی تصرف میں لاتے ہیں۔ عشقیہ شاعری کے ساتھ ساتھ ریختی کا دیوان بھی ہاشمی نے مرتب کیا ہے۔ اور اس صنف سخن میں یہ پہلی کوشش ہے اس کی زبان کافی صاف ہے۔ نمونے کے اشعار درج ذیل ہیں۔

سجن آویں تو پردے سے نکل کر بھار بیٹھوں گی
بہانہ کرکے موتیاں کا پرونے ہار بیٹھوں گی
کنے کو چپ کیتی ہوں میں ولے میں دمیں گھٹ کی ہوں
نزک ہو ہاشمی سوں مل کو آٹھوں پہار بیٹھوں گی
نزک میں ان کے جانے کو خوشی سوں شاد ہوں دمیں
ولے لوگاں میں دکھلانے کوں ہو بیزار بیٹھو گی[۵۸]

بھار (باہر)، کنے (کہنے)، کتی ہوں (کیا ہوا ہے)، نزک (نزدیک) ہاشمی نے دکنی الفاظ کے ساتھ اردو، فارسی، عربی کے تمام الفاظ ملا کر استعمال کیے ہیں اس لیے ہاشمی کا اسلوب کافی نکھرا ہوا ہے بلا شعبہ وہ دکن اور عادل شاہی دور کا ایک بڑا شاعر ہے۔

محمد امین ایاغی:

محمد امین ایاغی کی ۱۶۶۹ء میں پند و نصائح سے معمور مثنوی نجات نامہ ملتی ہے اسی دور میں شغلی کی مذہبی مثنوی پند نامہ بھی موجود ہے۔

سیوا:

سیوا گلبرگہ کا رہنے والا تھا۔ علی عادل شاہ کے دور میں بیجاپور آیا۔ کسیوا نے ۱۶۸۰ء میں مثنوی روضۃ الشھدا کا اردو نظم میں ترجمہ کیا۔ اور اس نے مرثیے بھی لکھے۔ اسی دور کی ایک اور شاعر **علی** نے بھی مثنوی پند دلبند لکھی۔ جو شائع بھی ہوئی۔

مرزا بیجاپوری ہاشمی:

مرزا بیجاپوری ہاشمی کا ہم عصر تھا وہ صرف نعت، مرثیہ اور منقبت لکھتا تھا۔ اس کے دور میں علی عادل شاہ کی بادشاہی اور بیجاپور کی آزادی اور مرکزیت ختم ہو چکی تھی نہ دربار رہا تھا اور نہ قدردان۔ بیجاپور کی آزادی ختم ہو جانے پر عوام الناس بے حد غمزدہ تھے سوائے افسوس اور غم کے ان کے بس میں اور کچھ نہ تھا۔ شاید اسی سبب اس دور میں مرثیہ گوئی خوب پروان چڑھی۔ مرزا کے مرثیوں کی زبان صاف اور فارسی اسلوب کے زیر اثر ہے۔ چونکہ بیجاپور پر اورنگ زیب عالمگیر کا قبضہ ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا نے شہادت کے سلسلے میں اپنے مرثیوں میں شعوری طور پر رونے رُلانے کا اہتمام کیا تھا۔ یہ طرز اور انداز عوام میں بہت مقبول ہوا۔ مرزا نے اپنے مرثیوں کی مقبولیت دیکھتے ہوئے اپنے مرثیوں میں مذہبی جذبات کو دل گداز اور غم انگیز پیرائے میں ابھارا۔ موجودہ دور میں اسلوب اور موضوعات ایک تسلسل کے ساتھ دکن میں سے آئے۔ روایت کی یہ لکیر ایک سرے کو دوسرے سرے سے ملاتی نظر آتی ہے۔ مرثیے کی روایت میں مرزا کی تاریخی حیثیت مستند ہے۔ مرزا کی زبان کافی حد تک نکھری ہوئی اردو ہے اس کے مرثیے آج بھی دکن میں پڑھے جاتے ہیں ایک مرثیے کا مطلع نمونے کیلئے پیش کیا جاتا ہے۔

الودا اے الودا شاہ شہیداں الودا
الودا ابن علی دو جگ کے سلطاں الودا
یو شفق نتیں ہے گگن پر صبح و شام اس دردسوں
نت بھرادیں لہو منے دامن گریباں الودا
شہ کا ماتم سن دریا کی موج نت نعرا کرے

غرق ہیں اس غم سوں سب لولو و مرجاں الودا[۵۹]

الوداع کو تلفظ کے زیر اثر الودا لکھا ہے۔ یعنی جیسا بولو ویسا لکھو ایک اور مرثیے میں سلام کی روایت مرزا کے ہاں اس طرح ملتی ہے۔

سرور ہر خاص و عام مقصد ہر رنگ و نام
مجمع پر صبح و شام شاہ سلام علیک
صاحب حیدر یقین تخت خلافت نشین
روزی دنیا و دین شاہ سلام علیک
نور شہادت توئی تاج سعادت توئی
شیر شجاعت توئی شاہ سلام علیک[۶۰]

محمد قلی قطب شاہ:

محمد قلی قطب شاہ گولکنڈہ کے تخت پر ۱۵۸۰ء میں بیٹھا۔ اور تینتیس سال حکومت کی اس کا دور سلطنت گولکنڈہ کی تاریخ کا سنہری دور تھا۔ بادشاہ نے اپنے دور حکومت میں مختلف مذہبی رسومات دھوم دھام سے منانے کا اہتمام کیا۔ محلاتی ماحول کی بنا پر حسن پرست تھا۔ پُر گو شاعر تھا۔ اس نے پچاس ہزار اشعار کہے تھے لیکن اس کا کچھ حصہ دستیاب ہو سکا ہے۔ جو لگ بھگ ۱۲۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ اردو زبان کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ چونکہ دربار کی زبان بھی فارسی تھی۔ اس نے اپنا دیوان فارسی طریقے سے مرتب کیا۔ لیکن عام بول چال میں بادشاہ اور عوام آپس میں (اردو) دکنی میں بات چیت کرتے تھے۔ حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں۔

> قلی قطب شاہ کی شاعری فارسی عروج کی ہندی زبان میں اشاعت تھی جس نے اردو زبان کے مستقبل میں ہمیشہ کے لیے ایک ہنگامہ خیز انقلاب پیدا کر دیا۔۔۔۔ اس کا پہلا نتیجہ قلی قطب شاہ کا کلیات ہے اس میں اردو زبان، اوزان و بحور، جذبات و تخیل اور تشبیہ و محاورے میں فارسی زبان کی تابع داری بنا دی گئی ہے۔ اور ہندی جذبات و تخیلات و اوزان ترک کر دیئے گئے ہیں۔ اس تبدیلی نے اردو زبان کے دائرے میں بے حد وسعت پیدا کر دی اور اس میں ہر قسم کے مطالب و خیالات کی ادائیگی کے لیے استعداد آ گئی۔ فارسی کے پیوند نے اردو زبان کو ہر لحاظ سے مالا مال کر دیا۔[۶۱]

قلی قطب شاہ نے عشقیہ شاعری کے ساتھ ساتھ مناظر فطرت کو بھی موضوع سخن بنایا ہے اس لیے اس کی شاعری میں بعض جگہ نیچرل شاعری کی جھلک نظر آتی ہے۔ جیسے

روت آیا کلیاں کا ہوا راج
ہری ڈال سر پھولاں کے تاج
ناری مکھ جھمکے جیسے بجلی
انجل پاوک میں سیے اس لاج
چوندھر گرجت ہور مینھوں برست
عشق کے چمنے چمن موراں کا ہے راج[۶۲]

ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں۔

> قل قطب شاہ کے گیت آج بھی حیدر آباد دکن کی عورتوں کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ فارسی شاعری کی پیروی میں جو خواص کی روایت تھی' اس نے نہ صرف فارسی اضاف سخن، بحور اور اوزان کو اپنایا بلکہ موضوعات، تلمیحات، صنعیات و اشارات کو بھی اپنی شاعری میں سمو دیا۔[۶۳]

ملا اسد اللہ وجہی:

ملا اسد اللہ وجہی محمد قلی قطب شاہ کا درباری شاعر تھا۔ بادشاہ نے اسے ملک الشعراء کے خطاب سے نواز ہوا تھا۔ اس نے ایک مثنوی "قطب مشتری" لکھی ہے۔ جس میں قلی قطب شاہ اور مشتری کے عشق کو داستان کی صورت میں تحریر کیا ہے۔ اس

کتاب کی ابتداء میں وجہی نے اپنے کلام اور اپنے آپ کو بڑا شاعر ظاہر کیا ہے۔لہذا آغاز میں ہی اس کا انداز شاعرانہ تعلیٰ لیے ہوئے ہے۔مثلاً

جتے شاعراں شاعر ہو آئیں گے
سو منج تے طرز شعر کا پائیں گے
نہ پہنچے نہ پہنچا ہے گن گیان میں
سو طوطی منجھ ایسا ہندوستان میں[۶۴]

وجہی اپنے آپ کو نا صرف دکن بلکہ ہندوستان کا بڑا شاعر خیال کرتا ہے۔اور بڑے یقین سے کہتا ہے کہ ہر آنے والا شاعر اب اس کی پیروی کرے گا۔قطب مشتری کے علاوہ وجہی نے "سب رس" اور "تاج الحقائق" نثر کی کتابیں بھی لکھی ہیں۔"سب رس" شائع ہوگئی ہے یہ کتاب قدیم اردو کی مثالی کتاب سمجھی جاتی ہے۔اور آج کل مختلف جماعتوں کیلئے نصاب کا حصہ سمجھی جاتی ہے۔

وجہی اپنی شاعری میں منتخب الفاظ، بلند معنی' لفظ اور معنی میں باہمی رشتہ اور اشعار میں ربط کو ترجیح دیتا ہے۔اس کے علاوہ اس کے نزدیک شاعری میں سلاست کا ہونا بھی ضروری ہے۔وہ فارسی اسلوب کی روایت کو اپناتا ہے "سب رس" میں وہ اپنی زبان کو "زبان ہندوستان" کہتا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ شمالی ہند کی زبان کی پیروی کر رہا تھا جو تمام ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔مثنوی "قطب مشتری" اردو کی قدیم ترین مثنویوں میں شمار ہوتی ہے۔محبت کے فلسفے کو وہ یوں بیان کرتے ہیں۔

محبت لگیا ہے جسے پیوکا
نیس کوچ پروا اسے جیو کا
یہاں بادشاہی غلامی اہے
یو بد نامی نیں نیک نامی اہے
محبت میں ہوتا جہاں جگ اسیر[۶۵]
یہ امر ہے واں بادشاہ ہور فقیر

لگیا (لگی۔ہونا)، پیو (پی۔محبوب)، نیں (نہیں)، کوچ (کچھ)، جیو (جی) اہے (ہے)، ہور (اور)

مندرجہ بالا الفاظ جو مثنوی میں استعمال ہوتے ہیں اپنے دور میں بولے اور لکھے جانے والے الفاظ ہیں جو آج کل اجنبی نظر آتے ہیں لیکن اپنے دور میں یہ الفاظ غلط العام تھے۔دراصل جیسا تلفظ تھا ویسا املا بنالیا جاتا تھا۔ڈاکٹر جمیل جالبی وجہی کی قطب مشتری کے ضمن میں تحریر کرتے ہیں۔

> تخلیقی عمل کے شعور نے وجہی کے ہاں سلاست بیان کو پیدا کیا آج قطب مشتری صرف تاریخی اہمیت کی حامل ہے لیکن جب اسے آج سے تقریباً چار سو سال پہلے کے دور میں رکھ کر دیکھتے ہیں اور اس کا مقابلہ اس دور کی شاعری سے کرتے ہیں تو وجہی قدیم دور میں صف اول کا شاعر اور یہ مثنوی اس دور میں ایک کارنامہ معلوم ہوتی ہے۔۔۔قطب مشتری نہ صرف نئی روایت، مثنوی کی ہیت، قرون وسطی کے داستانوی مزاج، نئے رنگ سخن اور زبان و بیان کے جدید اسلوب بلکہ شاعری کے اعتبار سے بھی قابل قدر تصنیف ہے اس میں جذبات و احساسات کو موزوں الفاظ اور خوبصورت تشبیہات کے ذریعے پیش کرنے کا عمل ملتا ہے۔حسب ضرورت منظر کشی بھی ہے اور بات کو اثر آفرینی کے ساتھ بیان کرنے کا سلیقہ بھی۔جذبات کے رنگا رنگ پہلوؤں کو وہ اپنے بیانیہ انداز میں اس خوبصورتی سے بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والے میں شاعرانہ مسرت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔[۶۶]

وجہی کی شاعری میں سلاست اور لفظ و معنی کا ربط شمالی ہندی طرز فکر اور اسلوب ان اشعار سے عیاں ہوتا ہے۔

جو عاقل ہے یو بات مانے وہی
قدر اس ادا کی پچھانے وہی
عجب تحفے قدرت تے آنے لگے
کہ دیک اس ملک رشک کھانے لگے

عجب ایک اس وقت پر مرد تھا
ہنر وند عاقل جہاں گرد تھا[۶۷]

اگر اسلوب کا جائزہ لیا جائے تو فارسی اسلوب کی پیروی میں وجہی کی نثر کی کتاب "سب رس" زیادہ اجاگر ہوتی ہے "سب رس" اردو میں ادبی نثر کا پہلا نمونہ ہے اس سے پہلے کی نثر مذہبی نوعیت کی تھی۔ "سب رس" ایک تمثیلی داستان ہے اس میں "قصہ حسن ودل" کا بیان ہے۔ وجہی نے "سب رس" کی زبان کو نئے لسانی اور تہذیبی عناصر کے امتزاج سے تشکیل دیا ہے۔ یہ اُس دور میں ایک نئی چیز تھی۔ اس قسم کی تحریر پر وجہی نے اظہار افتخار کیا ہے۔ وجہی نے اپنے اس اسلوب کی خوبی یہ بتائی ہے کہ اس میں نظم اور نثر کی خصوصیات کو ملا جلا کر ایک نئی لطافت پیدا کی ہے۔ وجہی کے اس اسلوب اور طرز ادا کی خاص اہمیت ہے "سب رس" کی ابتدا میں وجہی لکھتا ہے۔

آج لگن اس جہان میں، ہندوستان میں ہندی، ہندی زبان سوں، اس لطافت، اس چھنداں سوں، نظم ہور نثر ملا کر، گلا کر نہیں بولیا، اس بات کوں اس نہات کوں، یوں کوئی آب حیات میں نہیں گھولیا۔ یوں غیب کا علم نیں کھولیا۔[۶۸]

"سب رس" کی نثر پر فارسی کا اثر الفاظ محاورات، اسلوب، لہجے اور صرفی پہلو پر چھایا ہوا ہے، یہ وجہی کا کارنامہ ہے کہ اُس نے فارسی اسلوب کو اس طرح اردو نثر میں شامل کیا ہے۔ کہ اس کی ادبی نثر نے ایک نئے ادبی اسلوب کو جنم دیا ہے۔ یہاں تک کہ یہ اسلوب آئندہ دور کے نثر نگاروں کیلئے بھی معیار بن گیا ہے۔ اس دور میں فارسی کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ اس نے دکنی کو ریختہ اور پھر اردو میں بدل دیا۔ وجہی کی نثر میں یہ حسن ورنگینی اس کی شاعرانہ زبان کے استعمال سے پیدا ہوئی ہے اس کے ساتھ ہی مقفی اور مسجع عبارت نے بھی دلکشی میں اضافہ کیا ہے۔ وجہی کا یہ سارا کام شعوری ہے۔ وجہی کی مقفی و مسجع چھوٹے چھوٹے جملوں کا سبب یہ ہے کہ وہ آہنگ اور قافیے کی خوش ادائیگی کے ذریعے پڑھنے والوں کو متاثر کرنا چاہتا تھا۔ اگر جملے طویل ہوتے تو فاصلے کے سبب سے یہ احساس کمزور پڑ جاتا۔ اس اسلوب اور فارسی طرز و آہنگ کے سبب دکنی زبان بدلتی نظر آتی ہے۔ وجہی نے اس طرح دکنی کو اردو سے ملانے کی شعوری کوشش کی ہے اور اسی لیے اس نے اپنی "سب رس" کی زبان کو "زبان ہندوستان" کا نام دیا ہے۔ اس لحاظ سے وجہی کو جدید ادبی نثر کا موجد کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس نے "سب رس" کی نثر کو اور "قطب مشتری" کی نظم کو طرز ادا کی رنگینی اور فارسی اسلوب کے ذریعے ادبی سطح پر لانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

ابن نشاطی:

ابن نشاطی عبداللہ قطب شاہ کے دور کا شاعر تھا اس نے ایک فارسی قصے "بساتین الانس" کا دکنی نظم میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ مثنوی "پھول بن" کی شکل میں ہے۔ جو ۱۶۵۵ء میں لکھا گیا۔ اس ضمن میں ابن نشاطی لکھتا ہے۔

بساتیں جو حکایت فارسی ہے
لطافت دیکھنے کی آرسی ہے
بچن کے باغ کی لے باغبانی
بساتیں کی کئی سو ترجمانی[۶۹]

اس مثنوی کا موضوع عشق ہے اس میں بادشاہ کی تعریف میں بھی اشعار موجود ہیں۔ مثنوی کے موضوع کے بارے میں ابن نشاطی لکھتا ہے۔

سراسر عشق کے لیے اس میں رازاں
کیے سو عشق بازی عشق بازاں[۷۰]

ابن نشاطی اپنی مثنوی میں جگہ جگہ منظر نگاری کے جوہر دکھاتا ہے اور زور بیان پیدا کرنے کے لیے کثرت سے موزوں تشبیہات کا استعمال کرتا ہے۔ جیسے

دسیا اوس ٹھار پریوں نوجہانیاں
کہ جیوں فردوس میں بیٹھا ہے رضواں
دسے یوں پھول میں لالے کے کالے

چوا جیئوں لعل کے پیالے میں گھالے

ضعیف ایسا ہوا اوس درد سوں میں آلے
اجل منجھ پیرہن میں ڈھنڈ سکے نیں

ابن نشاطی بنیادی طور پر انشاپرداز تھا لیکن اس دور میں شعر و شاعری کی قدر و منزلت دیکھ کر شاعری کی طرف راغب ہو گیا۔ڈاکٹر جمیل جالبی ابن نشاطی کی لسانی نکتہ وری کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

ابن نشاطی کے انشا پرداز ہونے کے باعث "پھولبن" میں یہ خصوصیت پیدا ہو گئی ہے کہ دوسرے شعراء کے برخلاف اس میں عربی، فارسی الفاظ صحت املا و تلفظ کے ساتھ استعمال میں آئے ہیں۔ یہاں ضرورت شعری کے لیے صحت تلفظ و املا کو قربان کرنے کی کم سے کم کوشش کی گئی ہے اسی سلسلے کی دوسری خصوصیت یہ کہ اس مثنوی میں حسن شعری کے جوہر نکھارنے کے لیے صنائع بدائع کو شعوری طور پر استعمال کیا گیا ہے۔قافیے کی صحت کا بھی خیال رکھا گیا ہے اور فارسی فن شاعری کے ہنر کو بھی التزام کے ساتھ برتا گیا ہے۔۔۔پھول بن کی یہ انفرادیت ہے کہ ابن نشاطی نے نظم میں "انشا" کی خوبیاں شامل کر دی ہیں۔۲ے

ابن نشاطی کہتا ہے۔

جکوئی صنعت سمجھتا ہے سو گیانی
وہی سمجھے میری یہ نکتہ دانی

ہر ایک مصرع اوپر ہو کر بجد خوب
رکھیا ہوں قافیہ نیا مستند خود

ابن نشاطی نے شاعری کے دو بنیادی اصول بتائے ہیں۔

۱۔صنائع بدائع صحت قافیہ اور خوب صورت تشبیہات

۲۔نصیحت اور صنعت مل ملکر ایک ہو جائیں۔تاکہ بلند شاعری وجود میں آئے۔ابن نشاطی نے خود بھی اس پر عمل کیا۔

اسی دور کے دوسرے شاعر قطبی، سلطان، سید بلاقی، شاہ راجو اور عابد ہیں۔جنہوں نے مثنویاں، نظمیں اور مرثیے لکھے۔

ابوالحسن تانا شاہ:

ابوالحسن تانا شاہ ۱۶۷۲ء میں حیدر آباد کا بادشاہ بنا۔تانا شاہ شاعر تھا۔اس کی شاعری میں شمال کے گہرے اثرات واضح نظر آتے ہیں۔ان اثرات کی وجہ سے اس کی زبان و بیاں میں صفائی و روانی پیدا ہو گئی ہے۔ فارسی تراکیب اور بندشیں اس کی شاعری میں موجود ہیں جو آگے چل کر ریختہ کی صورت اختیار کرتی ہے۔تانا شاہ کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

اے سرو گلبدن تو ذرا ٹک چمن میں آ
جیوں گل شگفتہ ہو کو میری انجمن میں آ

چاہتا ہوں وصف قد میں کروں فکر شعر کی
اے معنی بلند شتابی سوں من میں آ

اے جاں بو الحسن تو اچھے خوش لٹک ستی
بند قبا کو کھول کے صحن چمن میں آ

ان اشعار کا فارسی انداز، لہجہ اور رنگ سخن شمالی ہند کے اثرات کو واضح کر رہا ہے۔

طبعی:

اس دور کے شاعروں میں طبعی قابل توجہ شاعر ہے یہ غزل گو شاعر تھا مگر اس کی شہرت مثنوی "بہرام و گل اندام" کی بنا پر

ہے۔ابوالحسن تانا شاہ اس کا پیر بھائی تھا۔اس مثنوی کا قصہ تمام دکن اور شمالی ہند میں بھی مشہور ہوا۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے طبعی کی مثنوی کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

> یہ مثنوی زبان و بیان، فن اور ترتیب قصہ کے اعتبار سے زیادہ پختہ معلوم ہوتی ہے۔۔۔شعریت اور قصے کے اتار چڑھاؤ سے اس میں مثنوی کا فن ترقی یافتہ شکل میں نظر آتا ہے۔مثنوی میں اشعار کی تعداد اور عنوانات کی تقسیم میں ایک باضابطگی ملتی ہے۔۔۔اس کی زبان اور اسلوب بیان ریختہ سے قریب تر ہو گیا ہے۔اسی لیے اس مثنوی کو آج بھی آسانی کے ساتھ پڑھا جا سکتا ہے۔طبعی کی یہ مثنوی شمال کی زبان کے گہرے اثرات کے تحت بدلتی ہوئی زبان کی ترجمانی ہے

سراسر سنیا جو مری مثنوی
کہیا بات طبعی ہے تیری لوئی
ہی خوشحال سن کر یو باتاں مرے
اپس کے لے ہاتاں میں ہاتاں مرے

۔۔۔اس میں ایک توازن، ناپ تول اور ہیئت کے طول و عرض کے تناسب کا احساس ہوتا ہے۔قصے میں تسلسل بھی ہے اور ترتیب بھی ان تمام چیزوں نے ملکر ادبی و فنی اعتبار سے اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کر دیا ہے۔۵؎

اورنگ زیب عالمگیر کی فتح کے بعد گجرات، گولکنڈہ اور بیجاپور کی ریاستیں ختم ہو کر ایک مرکز میں شامل ہوگئی تھیں۔ان ریاستوں کی عوام جن میں شعراء بھی شامل تھے اپنی صدیوں پرانی حکومتیں ختم ہو جانے پر غمزدہ تھے اور دوسرے ان ریاستوں میں فتح کے فوراً بعد انتشار کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔نفسانفسی اور عدم تحفظ کا عالم تھا۔اکثر شعراء نے طویل نظمیں اور مثنویاں چھوڑ کر مرثیہ لکھنا شروع کر دیا تھا جو ان کے غم اور دکھ کی علامت کے طور پر ظاہر ہوا۔مثنوی اور طویل نظمیں لکھنے کے لیے اطمینان قلب اور فارغ البالی کی ضرورت ہوتی ہے۔اور یہ بغیر شاہی قدردانی اور درباری قدر و منزلت کے ممکن نہیں تھی۔لہذا اس دور میں مرثیہ گوئی خوب پروان چڑھی۔

اسی دور کے دوسرے شعراء میں خواص، سیوک، فائز، افضل، محبّ، غلام علی لطیف قزلباش اور شاہ قلی خان ہیں جنہوں نے پندنامے، مثنویاں اور غزلیں لکھیں۔

پیرزادہ روحی:

احمد آباد کے ایک مشہور اور بڑے شاعر پیرزادہ روحی تھے۔انہوں نے بھی مرثیہ گوئی کی۔روحی زوال حیدرآباد کے وقت کا ایک بڑا شاعر تھا وہ ۱۷۳۱ء میں فوت ہوا۔اس کی زبان صاف اور نکھری ہوئی نظر آتی ہے۔مرثیہ کے ساتھ ساتھ مخمس اور غزلیں بھی اس نے لکھیں۔ان غزلوں اور مرثیوں سے شہر آشوب کی جھلک ملتی ہے۔روحی کے ایک مرثیے کے چند اشعار یہ ہیں۔

آج غم ناک ہیں چمن کے گل
بلکہ دل چاک ہیں سمن کے گل

غم زادہ سینہ داغ حیراں ہے
نرگس ولالہ یاسمن کے گل

یوں نہ لالے شفق کے دستے ہیں
لہو میں ڈوبے ہیں سب گگن کے گل

نقش پا دیکھ دل ہوس رکھتا
سر پہ رکھنے کوں تجھ چرن کے گل ۶؎

اس مرثیے میں پہلے مصرعہ کے لفظ چمن کو وطن سے بدل دیں تو پورے مرثیے کا اظہار وطن کے اجڑنے کی طرف ہو جاتا ہے اُسوقت فارسی اسلوب نے دکنی اسلوب کی جگہ لے لی تھی اور شعراء شمالی ہند کے ریختہ گوئی کی پیروی کو بہتر سمجھنے لگے تھے اسی

طرز میں لکھا ہوا یہ روحی کا مرثیہ ہے۔

فقیراللہ آزاد:

فقیراللہ آزاد خاص حیدرآباد دکن کے رہنے والے اور اردو کے اچھے شاعر تھے۔ یہ شاعر ولی کے دور کے تھے۔ ولی نے ان کی کئی غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں۔ ایک مشہور شعر جس پر ولی نے تعریف کی اور اس پر ایک شعر لکھا

سب صنعتیں جہاں کی آزاد ہم کو آئیں
پر جس سے یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

اس شعر پر ولی کا شعر لکھا۔

آزاد سے سنیا ہوں یہ مصرعہ مناسب[۸]
جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

شیخ داؤد ضعیفی:

اورنگ زیب عالمگیر کی فتح دکن کے وقت یہ حیدرآباد (دکن) میں تھا۔ یہ مشہور شاعر تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر کی فتح دکن پر اس نے اپنے اشعار کے ذریعے بادشاہ کو خوش آمدید کہا اور اس کی مدح میں ایک مثنوی لکھی یہ مثنوی ۱۶۸۸ء میں لکھی۔ مثنوی کے چند اشعار یہ ہیں۔

یہ دور جہاں دار اورنگ زیب
کہ جس تے ہوا اس زمانے کوں زیب

شہنشاہ عادل اہے در امور
کہ بدعت ضلالت ہوا جس سے دور

عجب فتح و نصرت ہے اس کی سنگات
جو کوئی نئیں کیا اس سوں دعوے کی بات
کہ شاہاں بھی اول ہوئے ہیں تو کیا
نہ کوئی زہد و تقوے میں ایسا دسیا

اہے اس منے بھی ولی کی صفات
کہ ہو آئے جو موں سوں کاڑے سو بات

بڑا دین اسلام کا کارساز
الٰہی توں کر عمر اس کی دراز[۹]

ضعیفی کی زبان اردو کے قریب پہنچ گئی ہے۔ چند ایک الفاظ جو دکنی لہجے اور زبان پر چڑھے ہوئے تھے وہ ابھی نہیں چھٹے۔ لیکن پھر بھی شمالی ہند کی زبان کی چاشنی صاف نظر آ رہی ہے۔

سید محمد فراقی:

یہ بیجاپور کا شاعر تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر کی فتح کے بعد اس نے دہلی کا سفر کیا تھا۔ وہاں کے تذکروں میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ اس نے تصوف کے مضامین پر مشتمل ایک مثنوی "مراۃ الحشر" لکھی تھی۔ لیکن مقبولیت غزل گو شاعر کی حیثیت سے ہوئی۔ چونکہ زبان پر بیجاپوری کے اسلوب کا اثر ہے۔ جس کی وجہ سے جا بجا دکنی الفاظ ان کی شاعری میں مل جاتے ہیں لیکن پھر بھی کسی حد تک یہ نکھری ہوئی اردو میں شاعری کی کوشش کی ہے۔ ولی نے بھی دو جگہ اپنی شاعری میں اس کا ذکر کیا ہے۔ دراصل یہ ذکر تنقیدی انداز میں ہے جو اس نے اپنے ہمعصر شاعر ہونے کے سبب اسے کم تر ثابت کرنے کے لیے کیا تھا۔

تیرے اشعار ایسے نئیں فراقی

کہ جس پر رشک آوے گا دلی کو[۸۰]

کلام میں متروک دکنی الفاظ کا اثر صاف نظر آتا ہے۔بعض اشعار میں بیان کی صفائی اور عاشقانہ جذبے کا اظہار متاثر کن حد تک ملتا ہے۔چند اشعار ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

مجے اے حسن کا ساقی لباں کا مے پلاتا نیئں
ارے ظالم میں مرتا ہوں تجے کچھ رحم آتا نیئں

ہمنا کے دل کو جس دم تم لے چلے پیارے
موہنہ تکتے رہ گئے یہ ہمدم سبھی بچارے

فراقی کشتہ ہوں اس آن کا جس دم کہ وہ ظالم
کمر سوں کھینچتا خنجر، چڑھاتا آستیں آوے[۸۱]

فراقی کی ادبی خدمت یہ ہے کہ اس نے شاعری کی روایت کو دہلی میں مقبول و مروج کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔فراقی کی نعت کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

مدینے میں اگر پیدا ہوا ہوتا تو کیا ہوتا
محمدؐ کی گلی بھیتر فنا ہوتا تو کیا ہوتا
ازل کی دین میں یارب اگر مفلس بھکاری ہوں
نبی کے آستانے کا گدا ہوتا تو کیا ہوتا

نظر ہے علم منطق ہور معانی میں فراقی کوں
اگر علم حدیث مصطفے ہوتا تو کیا ہوتا[۸۲]

اس نعت میں صاف ستھری اردو پائی جاتی ہے۔یہ زبان ولی کی زبان سے کسی طرح کم بلیغ نہیں۔فراقی کے اشعار سن کر دہلی والوں نے بھی انہیں پسند کیا اور داد دی۔تذکرہ نویسوں نے اپنے تذکروں میں فراقی کا ذکر کیا۔

امین گجراتی:

امین گجراتی اورنگ زیب عالمگیر کی فتح دکن کے بعد مشہور ہوا دوسرے لفظوں میں یہ اورنگ زیب عالمگیر کے دور کا شاعر تھا۔اس دور میں شمال اور دکن کی زبانیں تقریباً ایک ہوگئی تھیں۔اس ملاپ سے اردو زبان کا اسلوب ریختہ کے نام سے علاقائی سطح کے ساتھ ساتھ پورے برصغیر میں عام ہوگیا تھا۔زبان و ادب کی علاقائی تخصیص تقریباً ختم ہوگئی تھی۔اس تناظر میں "امین گجراتی" نئے ادبی معیار کا حامل نظر آتا ہے۔اس نے اورنگ زیب عالمگیر کے آخری دور ۱۶۹۷ء میں اپنی مشہور مثنوی "یوسف زلیخا" مکمل کی۔یہ مثنوی ۱۴۱۱۴ اشعار پر مبنی ہے۔اس نے اپنی زبان کو گوجری کہا۔

زمانے شاہ اورنگ زیب کے میں
لکھی یوسف زلیخا کوں امیں نیں
الٰہی توں ایسا عامل شہنشاہ
رکھیں جب لگ رہے قائم مہر ماہ[۸۳]

اس دور میں دکنی زبان میں فارسی، اسلوب و معیارات شامل ہو رہے تھے۔اور بیان کے اسالیب، رمزیات، صنعیات اور استعارات وغیرہ میں فارسی ادب کی نقل ہو رہی تھی۔یہ زمانہ فارسی سے مقامی زبان میں ترجموں کا دور تھا۔"یوسف زلیخا" بھی ترجمہ ہی ہے۔جو فارسی سے کیا گیا۔اس مثنوی میں امین گجراتی نے وہی ہیت استعمال کی جو فارسی میں نظر آتی ہے۔قصے میں وہ روایت ہے جو حضرت سلیمانؑ سے منسوب ہے۔لیکن قصے میں بیان کردہ رسم و رواج، مناظر اور تہذیب و معاشرت تمام کے تمام مزاج کے اعتبار سے ہندوی ہیں۔فنی اثر آفرینی کے اعتبار سے امین گجراتی کی یہ مثنوی ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔مثنوی میں عشق کا بیان کردہ اضطراب اور کیفیت کچھ اس طرح سے ہے۔جس سے اس دور کی زبان کی جھلک اور مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔

زمانے کا ستم بسیار ہے رے
زمانہ توں بڑا خونخوار ہے رے

کسی کوں عشق بھیتر ہے جلاتا
کسی کوں ہجر بھیتر ہے رلاتا

محبت کی کسی کے سر میں تروار
لگا تاہے انے ہے ڈالتا مار
اگر توں شاہ ہے تو تھام بتلا
اگر معشوق ہے تو نام بتلا

مرے دل کوں چھپا کر لے گیا تیں
اپس کا نام مجہ کوں ناں کہا تیں

ہبیں میں نام تیرا کس کوں پوچھوں
مقام اور تھام تیرا کس کوں پوچھوں[۸۴]

اس دور میں دکنی زبان اچھی خاصی صاف ہوجاتی ہے اس میں فارسی اسلوب اور روایت کا اثر گہرا ہوجاتا ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی اس دور کی زبان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

> دکن اور شمالی ہند کی زبان و بیان اور اسالیب میں کوئی خاص فرق باقی نہیں رہتا۔اب اس کے مزاج میں وہ مقامی رنگ باقی نہیں رہا جس کے سبب وہ گجرات میں گجری اور دکن میں دکنی کہلا رہی تھی۔گیارہویں صدی ہجری کا محاورہ زبان مقامی رنگ و اثر کا حامل تھا۔لیکن بارہویں صدی ہجری کا وسط قدیم اردو ادب کی حد فاصل ہے۔اب قدیم محاورے کی جگہ وہ جدید محاورہ زبان لے لیتا ہے۔جو ریختہ کے نام سے سارے برعظیم کے لیے جدید معیار سخن بن گیا ہے۔[۸۵]

گوجروی اور دکنی ادیب،شعراء اورنگ زیب عالمگیر کی فتح کے بعد بڑی حد تک شمالی ہند کی زبان لکھنے اور بولنے لگے تھے۔ان کی اردو کافی صاف ہوگئی تھی۔پھر بھی ان کی شاعری میں عالمگیری دور تک مقامی الفاظ کسی نہ کسی حد تک لکھے جاتے رہے۔کیونکہ جو الفاظ کسی علاقے کا روزمرہ ہوجائیں انہیں ترک کردینا آسان نہیں ہوتا بلکہ ان کا استعمال انہیں خوبصورت بناتا ہے۔ان میں سے کچھ الفاظ درج ذیل ہیں۔توں(تو)،کوں(کو)،میں سیوں(سے)،نہیں(نہیں)،تمن(تم)،جیوں(جیسے)، یو(یہ)،تمامی(تمام)،نانوں(نام)،نزیک(نزدیک)،اہے(ہے)،اتھے(تھے)،لگ(تک)،زماناں(زمانہ)،شیشا(شیشہ) ،پانو(پاؤں)،دھوناں(دھونا)،طیار(تیار)،بیوناں(بیونا)

دکنی زبان کا عام مزاج اس میں پایا جاتا ہے۔

مذکر مونث شاعر کی مرضی سے لکھ دیا جاتا جیسے ابن نشاطی کہتے ہیں۔"مجھے یکدن دیا ہاتف نے آواز" واحد جمع کے سلسلے میں اگر فاعل جمع ہے تو صفت اور فعل بھی جمع بنا لیے جاتے جیسے

عورتاں پانی بھرتیاں،چلیتاں نظر آتیاں ہیں،ادھر سے ادھر آتیاں جاتیاں

عربی فارسی کے زیر اثر اردو الفاظ کا اختتام "الف" کے بجائے "ہ" پر کیا جاتا۔

جیسے کمرا،انڈا،پراٹھا،بھیجا،وغیرہ کو کمرہ،انڈہ،پراٹھہ،بھیجہ لکھا جاتا بہت سے الفاظ ملا کر لکھ دیے جاتے جنہیں سمجھنا مشکل ہوجاتا۔

جیسے ضابطخان۔علیمحمد(ضابطہ خان۔علی محمد) کچھ شعراء نے عربی فارسی سے داخل الفاظ کی مشکل ادائیگی سے بچنے کے لیے ان کی جگہ مقامی الفاظ استعمال کیے کچھ جان بوجھ کر مقامی الفاظ اسے لیے استعمال کیے تاکہ وہ اپنی بات دوسروں تک آسانی

سے پہنچا سکیں۔اس قسم کے چلن کے باعث عربی فارسی الفاظ بھی بگاڑ کر رکھ دیئے گئے۔

ذیل میں اس دور کے املا کی چند مثالیں تحریر کی جاتی ہیں۔

شیخ بہاوالدین باجن اردو کو زبان دہلوی اور ہندوی دونوں طرح کہتے رہے۔وہ نام کو ناوں۔سکے کو سکیے۔سکھ کو سکھو لکھتے رہے۔

علی محمد گام دھنی نے فارسی روزمرہ کا ترجمہ اردو محاورے میں کیا۔اس نے اپنا نام اسی طرح ملا کر لکھا ''علیمحمد'' دوسرے شعراء کے کلام میں املا کچھ اسطرح ملتا ہے۔"ہ" کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے وہ مجھ کو مج، تجھ کو تج۔اندھے کو اندے۔بوجھنا کو بوجنا۔پہلا کو پیلا لکھا ہے۔سے کے لیے سیں اور سوں کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ٹ۔ڈ۔ڑ وغیرہ کو ت۔د۔ر لکھا ہے۔

لکھی کا املا لیکھی ملتا ہے۔(ز) کے بجائے (ج) کا استعمال کیا گیا ہے۔"ہور" کی جگہ "اور""جے اور جو" کی جگہ "جبکہ" "لاگنا" کی جگہ "لگنا"اور "روان لاگا" کی جگہ "رونے لگا" لکھا گیا ہے۔پڑھنا۔دیکھنا۔لکھنا۔کا ماضی مطلق پڑھیا۔دیکھیا اور لکھیا ہے۔دو"ٹ"والے الفاظ میں ایک ٹ کو ت میں بدل دیا ہے جیسے ٹوٹیاں کو توٹیاں وغیرہ

عربی فارسی الفاظ املا مشکل خیال کرتے ہوئے آسانی کے لیے اس طرح بدل دیا ہے شیشہ کو شیشا۔غصہ کو غصا۔قبضہ کو قبضا۔نفع کو نفا۔شفیع کو شفی۔وضع کو وضا۔ضمیر کو زمیر۔حکم کو ہوکم۔خطرہ کو خطرا وغیرہ فعل بنائے گئے۔فعل کے ساتھ "چ" بڑھا کر "ہی" کے معنی لیے گئے جیسے تو نچ سے تو ہی وغیرہ یاں لگا کر فعل کی جمع بنائی گئی جیسے۔چلتیاں۔بلتیاں۔اوچھلتیاں وغیرہ" ک اور گ"میں کوئی فرق نہیں اکثر" ک" لکھا جاتا رہا۔اسی طرح"ی"اور "ے" کوئی فرق نہیں اکثر چھوٹی "ی"ہی لکھی گئی۔

"ہ" کو بلا امتیاز مختلف شکلوں میں لکھا گیا ہے۔جیسے "ہہ۔ھ۔ہ"۔عام طور "ہ" کی جگہ "ھ" لکھی گئی۔"ء" کے نیچے اگر زیر ہو تو کہیں کہیں دو نقطے بھی ملتے ہیں۔صرف "نہ" کو دوسرے لفظ سے جوڑ کر لکھا گیا۔میراں جی نے "گ" پر ایک کش لگایا ہے اور اس کے نیچے تین نقطے لگائیں ہیں جیسے۔"ک"( گ)

حافظ محمود شیرانی نے اورینٹل کالج میگزین مطبع ۱۹۳۰ء میں مزید املائی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ

جمع، جمع مضارع اور مصدر "ہ" پر ختم ہوتے ہیں۔جیسے "کہنہ۔دھرنہ۔برسنہ "( کرنا۔دھرنا۔برسنا) اور "تمہ۔انہ۔لینہ۔دینہ "(تم۔ان۔لین دین) وغیرہ۔حروف مشدد کو دوبارہ لکھا گیا جیسے کتتا ( کتّا) وغیرہ ۸۶

جبکہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کہتے ہیں۔

"گ" کے لیے "ک" لکھا ہے اور "گ" کی آواز کے لیے نیچے تین نقطے لگا دیئے ہیں۔۸۷

"نورنامہ "میں " گ "پر بھی ایک کش لگایا ہے۔ٹ پر ط کی جگہ چار نقطے ہیں۔

جیسے "ث "ڑ پر ط کی جگہ نیچے تین نقطے ہیں جیسے "ر"۔"ہ" کو اکثر "ھ" لکھا ہے۔ی اور ے کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔۸۸

ملا وجہی کی "سب رس "میں الفاظ اسطرح ملتے ہیں۔

مذکر اور مونث دونوں کی جمع "اں" سے بنائی گئی ہے۔جیسے "ہاتاں۔کتاباں۔بھائیاں۔عورتاں۔جانتیاں۔باتاں وغیرہ "ایسی۔جیسی۔جتنی۔کیا کی جمع "ایسیاں۔جیسیاں۔جتنیاں۔کیاں لکھی ہے۔مزید دیکھیے۔

"سی" کو مستقبل کے لیے استعمال کیا ہے۔اکثر عربی فارسی الفاظ سادہ بنا کر لکھ دیا گیا ہے۔جیسے نفا۔طما۔ماملہ۔واقا( نفع۔طمع۔معاملہ۔واقع) وغیرہ الفاظ کی تکرار کو لکھنے کا طریقہ یہ ہے گھر گھر کو گھرے گھر۔در در کو درے در وغیرہ ۸۹

اس کے علاوہ جمع بنانے کے لیے لفظ کے آخر میں "اں"لگا دیا جاتا۔جیسے بات کی جمع باتاں۔پلک کی جمع پلکاں وغیرہ اسی طرح گھوڑا سے گھوڑن وغیرہ اور مصدر "ن" سے بنایا جاتا رہا۔جیسے دیکھنا، چلن، آہن، جاون وغیرہ عام طور پر حروف علت نکال کر لفظ لکھے جاتے جیسے۔سورج ( سرج)۔اوپر ( اُپر)۔سوار (سُار)۔سونا(سُنا) وغیرہ

تشدید کا خاص رواج نہ تھا۔تشدید والے الفاظ بغیر تشدید لکھے جاتے اسی طرح علامت "نے" کے بغیر ہی جملہ بنا لیا جاتا۔ضمائر میں مجہ۔بجے۔ہمن۔ہمنہ، اوس۔اوسے، وغیرہ لکھا جاتا۔"ق" کو خ میں بدل دیا جاتا جیسے وقت کو وخت، بندوق کو بندوخ، صندوق کو صندوخ وغیرہ" ۹۰ مزید دیکھیں

ہکارآوازوں کواسطرح لکھاجاتاسکھیاں کوسکیاں،لکھ کولک، پوچھ کو پوچ،وغیرہ اسی طرح دودھ کی جگہ دود، مجھ کومج، آنکھ کوآنک ، دیکھ کودیک[۹۱]، بوجھ کو بوج، کہی کوکئی، وہی کووئی، کہو کوکئو، رہی کورئی، پلک کی جمع پلکھاں۔ جگمگ کوجھگمک، پرچم کو پرچھم، کندھا کو کھندا

مزیددیکھیں

مد کی جگہ عموماً زبر لکھا ہے اور کہیں کہیں وہ[۹۲] الف بھی لکھتے ہیں۔ جیسے آدمی کوادمی، آسمان کواسمان اور بادل کی جگہ بدل، کاجل کی جگہ کجل، ہنسی کو ہانسی، پتلی کی پوتلی وغیرہ

افعال کی ماضی بناتے وقت "یا" کااضافہ کیا جاتا رہا جیسے چلیا، دیکھیا، بولیا، سنیا وغیرہ[۹۳]

اورمزیددیکھیں

"ٹ۔ د۔ ڑ۔ ٹھ۔ ڈھ اور ڑھ " کو اردو رسم الخط میں ظاہر کرنے کے لیے تاریخ کا مطالعہ بھی دلچسپ ہے۔ ان حروف کی آوازوں کی تحریری صورتوں میں وقتاً فوقتاً[۹۴] تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ ابتدا میں ان حروف کوت۔ د۔ ڑ ہی لکھا جاتا رہا۔ مثنوی کدم راو پدم راو میں یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

جیسے چھوتا (چھوٹا)' دور (دوڑ)، کھرا (کھڑا) پکر (پکڑ) وغیرہ مثنوی کے آخری حصے میں "ڈ" اور "ڑ" کے لیے د اور ر کے نیچے تین نقطے بھی لگا دیئے گئے ہیں جیسے در (ڈر)، مور (موڑ)، پیرا (پڑا) وغیرہ

" کربل کتھا" میں تین نقطے نیچے کے بجائے اوپر لگائے گئے۔ جیسے " ث (ٹ) ذ (ڈ)، ژ (ڑ) اوپیا (اٹھا) ہونث (ہونٹ) ذرنا (ڈرنا)، چمث (چمٹ)، پثر (پڑ) وغیرہ

قصہ "مہرافروز دلبر" میں "ٹ۔ ڈ" کے لیے "ط" کی جگہ چار نقطے لگائے گئے جیسے چھوتا (چھوٹا) بترا (بڑا) وغیرہ "عاشور نامہ" میں بھی چار نقطے ملتے ہیں۔

اس کے بعد کی تصانیف میں چار نقطوں میں سے اوپر والے دو نقطوں کی جگہ ڈش لگا دیا گیا۔ جیسے ث (ٹ)، د (ڈ)، ژ (ڑ) بعدازاں دوسرے لفظوں کو بھی ڈیش بنا دیا گیا۔ اوراسطرح لکھنے لگے۔ ت (ٹ)، د (ڈ)، ر (ڑ) وغیرہ

فورٹ ولیم کالج کی تحریروں میں بھی نقطے اور ڈیش ملتے ہیں۔ لیکن ط کا استعمال بھی غالباً فورٹ ولیم کالج ہی سے شروع ہوا تھا۔ اگرچہ وقت کے ساتھ ساتھ اس املا میں تبدیلیاں ہوئیں تاہم ولی سے غالب تک کی شاعری میں یہ تبدیلیاں محسوس کی جا سکتی ہیں۔

## حوالہ جات


۱ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو جلد اول، لاہور مجلس ترقی ادب ۱۹۸۷ص ۱۵۱
۲ ایضاً ص ۱۴۸
۳ ضیاءالدین برنی، تاریخ فروز شاہی اردو، لاہور، مرکزی اردو بورڈ، س ن، ص ۶۷۳
۴ شیرانی حافظ محمود، مقالات شیرانی، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۶، ص ۱۱۸
۵ ایضاً ص ۱۲۱۔۳۰
۶ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو جلد اول، لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷، ص ۱۰۲
۷ ایضاً ص ۱۰۳
۸ حامد حسن قادری، داستان تاریخ ادب اردو، کراچی۔ اکیڈیمک آفسٹ پریس، ۱۹۸۸، ص ۱۶
۹ بحوالہ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تحریر سہ ماہی، دہلی شمارہ نمبر ۲، ۱۹۷۶، ص ۲۹۴
۱۰ بحوالہ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو جلد اول، لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷، ص ۱۶۲
۱۱ بحوالہ ایضاً ص ۱۶۳
۱۲ بحوالہ ایضاً ص ۱۶۵
۱۳ بحوالہ زور محی الدین ڈاکٹر، دکنی ادب کی تاریخ، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۹، ص ۱۵
۱۴ ایضاً ص ۱۶
۱۵ ایضاً ص ۱۸
۱۶ ایضاً ص ۲۰۔۲۱
۱۷ ایضاً ص ۱۶۔۱۷
۱۸ ایضاً ص ۱۷۶
۱۹ ایضاً ص ۱۷۵
۲۰ ایضاً ص ۲۶
۲۱ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو جلد اول، لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷، ص ۲۴
۲۲ محمد ہاشم علی ڈاکٹر، میراں جی شمس العشاق، حیدر آباد نیشنل پریس، ۱۹۷۴، ص ۱۰۲
۲۳ ایضاً ص ۷۰
۲۴ ایضاً ص ۹۵
۲۵ زور محی الدین ڈاکٹر، دکنی ادب کی تاریخ، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۹، ص ۲۵
۲۶ ایضاً ص ۲۲
۲۷ ایضاً ص ۲۰۳
۲۸ ایضاً ص ۲۰۵

۲۹ ایضاً ص۲۰۵
۳۰ ایضاً ص۲۱۱
۳۱ بحوالہ ایضاً ص۳۵
۳۲ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو جلد اول، لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷، ص۲۲۲
۳۳ مسعود حسن خان ڈاکٹر مرتب، ابراہیم نامہ از عبدل، حیدرآباد۔ دائرہ المعارف العثمانیہ، ۱۹۶۹، ص۱۵۶
۳۴ زور محی الدین ڈاکٹر، دکنی ادب کی تاریخ، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۹، ص۴۱
۳۵ ہاشمی نصیر الدین، خاور نامہ، دکنی، اپریل معارف، ۱۹۳۱، ص۲۱
۳۶ سروری، عبدالقادر مرتب، قصہ بے نظیر، حیدرآباد۔ سلسلہ یوسفیہ، ۱۹۳۹، ص۴۵
۳۷ ایضاً ۶۷
۳۸ جمیل جالبی، ڈاکٹر مرتب، دیوان حسن شوقی، کراچی۔ انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۱، ص۱۲۲
۳۹ ایضاً ص۱۱۸
۴۰ ایضاً ص۹۳
۴۱ ایضاً ص۹۳
۴۲ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو جلد اول، لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷، ص۳۱۰
۴۳ ایضاً ص۳۱۱
۴۴ ایضاً ص۳۱۲
۴۵ ایضاً ص۳۱۵
۴۶ ایضا ص۳۱۶
۴۷ ایضاً ص۳۱۷۔۳۱۸
۴۸ عبدالحق مولوی ڈاکٹر، نصرتی، کراچی۔ انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۶۱، ص۲۲
۴۹ ایضاً ص۴۸
۵۰ ایضاً ص۳۹
۵۱ ایضاً ص۳۰
۵۲ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو جلد اول، لاہور مجلس ترقی ادبم، ۱۹۸۷، ص۳۵۲
۵۳ ایضاً ص۳۶۰
۵۴ ایضاً ص۳۶۶
۵۵ ایضاً ص۳۶۶
۵۶ ایضاً ص۳۶۷
۵۷ ایضاً ص۳۶۷
۵۸ بحوالہ زور محی الدین قادری ڈاکٹر، دکنی ادب کی تاریخ، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۵۹۔ ص۵۷
۵۹ حفیظ قتیل ڈاکٹر مرتب، دیوان ہاشمی، حیدرآباد۔ ادارہ ادبیات اردو، ۱۹۶۱، ص۲۲۲
۶۰ ایضا۶۰

۶۱ محمود شیرانی حافظ، مقالات شیرانی، لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء، ص ۲۰۰
۶۲ محمود سید، محمد قلی قطب شاہ (سب رس) مئی، حیدر آباد، ۱۹۲۵ء، ص ۱۴
۶۳ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷ء، ص ۴۱۳
۶۴ مرتاض الدین، قطب مشتری، آج کل فروری، ۱۹۵۸ء، ص ۲۰
۶۵ ایضاً ص ۱۷
۶۶ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷ء، ص ۴۴۱
۶۷ مرتاض الدین، قطب مشتری، آج کل فروری، ۱۹۵۸ء، ص ۱۴
۶۸ مولوی عبدالحق ڈاکٹر مرتب، سب رس از ملا وجہی، کراچی۔ انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۳ء، ص ۲۳
۶۹ اکبرالدین صدیقی مرتب، پھول بن، دلی۔ ترقی اردو بورڈ، ۱۹۷۸ء، ص ۸۷
۷۰ ایضاً ص ۸۸
۷۱ ایضاً ص ۸۹
۷۲ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷ء، ص ۴۹۱
۷۳ اکبرالدین صدیقی مرتب، پھول بن، دلی۔ ترقی اردو بورڈ، ۱۹۷۸ء، ص ۲۱
۷۴ علی اصغر بلگرامی، ابوالحسن تانا شاہ، عالمگیر۔ مئی۔ خاص نمبر، ۱۹۳۲ء، ص ۲۷
۷۵ جمیل جالبی، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ، لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷ء، ص ۵۰۹
۷۶ ایضاً ص ۵۶۱
۷۷ زور محی الدین قادری ڈاکٹر، دکنی ادب کی تاریخ، کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۵۹ء، ص ۱۲۵
۷۸ نورالحسن ہاشمی (مرتب)، کلیات ولی، کراچی۔ انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۵ء، ص ۳۳
۷۹ سخاوت مرزا، ضیغمی دکنی کی ایک خاص تصنیف، کراچی نومبر، معارف، ۱۹۵۳ء، ص ۲۹
۸۰ ہاشمی نصیرالدین، فراقی دکنی، شہاب دسمبر، ۱۹۳۶ء، ص ۲۷
۸۱ ایضاً ص ۹
۸۲ ایضا ص ۲۰
۸۳ جاوید نہال، ایک قدیم دکنی مثنوی یوسف زلیخا، پٹنہ جنوری۔ صبح نو، ۱۹۶۳ء، ص ۲۴
۸۴ ایضاً ص ۲۷
۸۵ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷ء، ص ۱۴۳
۸۶ غلام مصطفیٰ خان ڈاکٹر، اردو املا کی تاریخ (نقوش)، سندھ اردو اکیڈمی، ۱۹۵۷ء، ص ۱۰۷
۸۷ ایضاً ص ۱۰۸
۸۸ ایضاً ص ۱۱۱
۸۹ ایضاً ص ۱۱۴
۹۰ مسعود حسن خان اردو زبان کی ابتدا اور ارتقاء کا مسئلہ، کراچی۔ فکر و نظر مارچ، ۱۹۶۹ء، ص ۱۷
۹۱ خلیل احمد بیگ ڈاکٹر، اردو کی لسانی تشکیل، علیگڑھ، ایجوکیشنل بک ہاوس، ۱۹۹۰ء، ص ۱۱۵
۹۲ ایضاً ص ۱۱۷